انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

سہ ماہی مجلہ

حیات نو

بلریاگنج

جنوری تا مارچ ۲۰۱۱ء

₹ 30/-

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

جنوری تا مارچ ۲۰۱۱ء

سہ ماہی مجلہ

حیاتِ نو

بلریا گنج

مدیر: زبیر ملک فلاحی

مجلس ادارت :

مشرف حسین صدیقی فلاحی	دہلی
مقبول احمد فلاحی	کیرلہ
ڈاکٹر عبدالباری فلاحی	دہلی
انیس احمد مدنی فلاحی	جامعۃ الفلاح

فی شمارہ:	اندرون ملک	۳۰/روپے
	بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
سالانہ زر تعاون:	اندرون ملک	۱۲۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ:	اندرون ملک	۳۰۰۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

نمائندے

لندن :	رضوان احمد فلاحی
دہلی :	نعیم احمد غازی فلاحی
علی گڑھ :	ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
ممبئی :	حافظ ابراہیم علی فلاحی
نیپال :	نذر الحسن فلاحی
یو اے ای :	خالد حسن رشید فلاحی
قطر :	محمد اکرم فلاحی
کویت :	محمد سہیل فلاحی
سعودی عرب :	انعام اللہ فلاحی

خط و کتابت کے پتے

- برائے ادارتی امور

انیس احمد فلاحی، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج
اعظم گڑھ (یوپی)

- برائے انتظامی امور و ترسیل زر

عرفان احمد فلاحی جامعۃ الفلاح
بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی- 276121
موبائل: +91-9453757380
ای میل: hayatenau123@gmail.com

Typing : Al-Qalam Art,
Aminabad, Lko. M. 08956168190

خطبہ حجۃ الوداع

"حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ نہ اس کے ساتھ خیانت کرتا ہے نہ اس کو جھٹلاتا ہے اور نہ بے سہارا چھوڑتا ہے، ہر مسلمان کی آبرو، مال اور خون دوسرے مسلمان پر حرام ہیں۔ تقویٰ یہاں ہے، آدمی کے برا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر گردانے۔"

(ترمذی)

MANPOWER CONSULTANT
IMPORTERS & EXPORTERS

Jamal
EXPORTS

REGN. NO. 002004/BOM/PER/1000+/2¾/3530/92

22 ZIA APARTMENT, 264, BELLASIS RD,
MUMBAI - 400 008. (INDIA)
TEL. : 0091-22-2308 2280, 2308 0892, 2309 5294
FAX : 0091-22-2300 1895, Dir. 23019376
E-mail: admin@jamalexports.in
MOB : 0091-9821332582 / 9869011494
SAUDI MOB. : 0556891550

DELHI
1952, 2nd Floor, Opp. Escort Heart Hospital,
Sarai Julena, New Delhi - 110025
Tel. 011-2684 2682, 2682 5679
Fax : 2694 2681 Mob : 98553 33075.

LUCKNOW
Flat / 7, 1st Flr. [illegible] Plaza,
Opp. Mehman Hotel, Hussain Ganj, Lucknow
Tel : 0522-2209423 Fax : 4072268 Mob : 09307225182

فہرست مضامین

اپنی بات (اداریہ)	زبیر ملک فلاحی	3

مقالات

ہندو مسلم فسادات......	ایس ایم مشرف	5
اسالیب القرآن	مقبول احمد فلاحی	22
دینی مدارس میں تدریس قرآن کا........	اعجاز احمد قاسمی	36
وبالوالدین احسانا کا مفہوم	ڈاکٹر محی الدین غازی	48
میرے بھیا میرے محسن میرے مربی	اقبال احمد اصلاحی ندوی مدنی	66
جامعہ کے لعل و نہار	عبدالرقیب فلاحی	75
انجمن کے انتخاب کی رپورٹیں		78

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

اپنی بات

زبیر ملک فلاحی

ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں جب بھی سوچئے تو ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے۔ پوری فضا میں کنفیوژن، عدم وضوح، پیچیدگی اور گوئم مشکل وگرنہ گوئم مشکل کی کیفیت رچی بسی محسوس ہوتی ہے۔ سرا ہے کہ ملتا ہی نہیں۔ جہاں سے بھی حل کی کوشش کیجئے تھوڑی دور چلنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ مسئلہ کی ایک تہہ اس کے نیچے ہے، اسے حل کرنے کے لئے اُسے پہلے سلجھانا ضروری ہے۔ اس طرح اتنے محاذ اور شعبے بن جاتے ہیں کہ ان میں ترجیحات کا مسئلہ خود ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔

ان مسائل کے حل کے لئے مختلف سطحوں پر کوشش بھی ہو رہی ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ ان کوششوں سے مسائل حل تو نہیں ہوتے یا کم ہوتے ہیں، ہاں مسائل کی گونج دور تک اور دیر تک سنائی دینے لگتی ہے۔

مسلمانوں کے مسائل کثیر الابعاد ہیں۔ اگر ہم مسلمانوں کو اور ملتوں کی طرح ایک ملت کی حیثیت سے دیکھیں تو اس اعتبار سے بہت سے مسائل ہیں اور اگر ایک دعوتی گروہ کی حیثیت سے دیکھیں تو اس اعتبار سے بھی بہت سے دوسرے مسائل ہیں۔ مسائل کا ایک پہلو داخلی ہے اور ایک خارجی۔ ان دونوں پہلوؤں سے مسائل کی الگ الگ فہرست ہے۔

ان مسائل کے حل کی کوششوں کا منظر نامہ یہ ہے کہ اس راہ میں کوشاں تحریکیں بھی ہیں اور تنظیمیں بھی، ادارے بھی ہیں اور انجمنیں بھی، شخصیات بھی ہیں اور افراد بھی۔ سب مسلم مسائل کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں لیکن حیرت ہے کہ ان کا کوئی متفقہ پلیٹ فارم نہیں ہے۔ انتشار کی اس حالت کو برقرار رکھنے کے لئے یہ ''زریں خیال'' مفکرانہ شان کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ مسائل اتنے زیادہ اور کام کی ضرورت اس قدر ہے کہ مزید تنظیموں، اداروں، انجمنوں اور شخصیات کی ضرورت ہے۔ حالاں کہ نہ تو فلسفہ اجتماع کی رو سے اور نہ ہی اسلامی نصوص کے حوالے سے انتشار محمود اور مطلوب چیز ہے۔

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے ماحول پر مضر اثرات نہیں مرتب ہو رہے ہیں۔ مسائل کے حل کی کوششوں اور دینی سرگرمیوں کے نتیجے میں پیدا شدہ کیفیت کو اگر ہم ''صحوہ اسلامیہ'' اسلامی بیداری سے تعبیر کریں تو اس کا تجزیہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ صحت مند نہیں بلکہ غوغائی اور خودرو پودوں کی طرح غیر مرتب ہے۔ اسلامی بیداری کا اگر عوامی سطح پر جائزہ لیا جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ عوامی بیداری کے

محرکات خالص اسلام کے علاوہ اور بھی چیزیں ہیں۔ قومی تفاخر کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ دینی جذبات میں فقہی مسالک اور ان کی عصبیتیں کارفرما ہیں۔ معاشی حالات اور رغبت معاشی امکانات کا بھی ایک عنصر پایا جاتا ہے۔ شخصی طموحات اور شہرت و نمود کا جذبہ بھی کارفرما نظر آتا ہے۔

ان کوششوں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ "ظاہرہ" پر بے حد توجہ دی گئی ہے۔ کیلنڈر اور ڈائری سے لے کر عظیم الشان کانفرنسوں کا انعقاد اور ان میں عوامی جذبات کا خیال کر کے بلکہ استحصال کرنے کے لئے بیرون ملک سے "قدآور اور معروف" شخصیات کو مدعو کرنا وغیرہ وغیرہ اس کے شواہد ہیں۔ یہ راگ اتنے اونچے سروں میں گایا جا رہا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ یہ دینی تنظیمیں نہیں بلکہ تجارتی کمپنیاں ہیں جو اعداد و شمار کی بنیاد پر اپنے نفع و نقصان کا فیصلہ کرتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ تحریکیں تنظیمیں بن کر رہ گئی ہیں اور تنظیموں نے اپنے مقاصد و اہداف کے حصول کے لئے جو میکانزم بنایا تھا خود اسی کا شکار ہوتی جا رہی ہیں۔ جسے داعی ہونا تھا وہ آہستہ آہستہ کلرک ہوتا جا رہا ہے، جسے حرکت و عمل کا پیکر ہونا چاہئے وہ بالکل روبوٹ ہوتا جا رہا ہے۔ تنظیم کو بحال رکھنے اور ترقی دینے کے لئے وسائل و ذرائع ناگزیر ہوتے ہیں۔ اس کا لازمی اثر یہ ہے کہ وہ افراد زیادہ ضروری قرار پاتے جا رہے ہیں جو زیادہ سے زیادہ وسائل فراہم کر سکتے ہیں۔ مسجدوں کی رونق کے لئے وہ سجدے نایاب ہوتے جا رہے ہیں جن سے روح زمین کانپ جاتی تھی۔ اس کی رونق کا انحصار اب سنگ مرمر کی سلوں اور اونچے اونچے میناروں پر ہوتا جا رہا ہے۔ تعلیم و تربیت میں کمال کی جگہ بام و در کی سجاوٹیں لیتی جا رہی ہیں۔ اس پورے منظر نامے میں جانکاہ حادثہ یہ ہے کہ فرد کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ ایک شخص جس مسند سے اٹھ جاتا ہے پھر وہ خالی ہی رہ جاتی ہے۔ ظاہر ہے تولنے کے بجائے سروں کی گنتی کا یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

اس حادثے سے بڑھ کر سانحہ یہ ہے کہ افراد سازی کا کوئی منصوبہ کہیں دور دور تک نظر نہیں آتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خیر و شر دل کی دو کیفیتیں ہیں، اعضاء و جوارح اس کی تصدیق یا تکذیب کرتے ہیں۔

مرا دل، مری رزم گاہ حیات
گمانوں کا لشکر، یقیں کا ثبات

اسلامی تحریک کا ہدف خارج سے زیادہ داخل ہے۔ داخل کا تزکیہ صرف "ظاہرہ" کو بہتر بنانے سے ممکن نہیں۔ اس کی قامت پر رائج الوقت تنظیمیت کا جامہ کبھی راس نہیں آتا۔ فکرمندوں کو اس کی فکر کرنی چاہئے۔ اس رخ پر فکر و عمل کو آگے بڑھایا جائے تو مسائل کے حل کی جانب پیش قدمی کا امکان ہے۔

ہندو مسلم فسادات

عام ہندوؤں کو محکوم بنائے رکھنے کی جدید حکمت عملی

ایس۔ ایم۔ مشرف*

کوئی مانے یا نہ مانے لیکن جہاں تک ملک کی فرقہ وارانہ صورت حال کا سوال ہے، عام طور سے لوگوں کے ذہنوں میں بات بیٹھی ہوئی ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنے وطن کے تئیں وفادار نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا رجحان پاکستان کی طرف رہتا ہے اور یہ کہ ان کو مبینہ 'مسلم وحشت گردوں' کے ساتھ ہمدردی ہے اور اسی لئے برہمنی عناصر، جن کے بارے میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ وہ بڑے ہی قوم پرست، محب وطن ہیں، شدت کے ساتھ مسلم مخالف ہیں۔ شاید اسی لئے وہ عام ہندوؤں کو 'بیدار' اور اسلام کے 'خطرے' سے خبردار کرتے رہتے ہیں۔ ایک اور سبب بھی یہ لوگ دہراتے رہتے ہیں، وہ یہ کہ عہد وسطیٰ میں مسلم حکمرانی کے تقریباً سات سو سالہ دور میں ہندوؤں پر مسلمانوں نے بڑے ظلم ڈھائے ہیں اور بڑی زیادتیاں کی ہیں۔

ان الزامات میں کیا حقیقت ہے، اس پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ جان لینا مناسب ہوگا کہ آخر برہمن واد کے علم بردار یہ عناصر ہیں کون جو بزعم خود ملک اور ہندو مذہب کی حفاظت کے ٹھیکے دار بن بیٹھے ہیں؟ یہ عناصر برہمنوں کے ایک چھوٹے سے طبقہ اور غیر برہمنوں میں ایسے انتہائی چھوٹے طبقہ پر مشتمل ہیں، جن کے ذہنوں کو اچھی طرح دھو مانجھ کر ایک مخصوص سانچے میں ڈھال دیا گیا ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ ذات پات کی تقسیم کا تعلق انسان کے جنم سے ہے، برہمن سب سے اعلیٰ ذات ہے اور ہندوستانی معاشرے پر بالادست رہنا ازل سے اس کی قسمت میں لکھا ہے۔ ایک انتہائی اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی برہمن مسلم مخالف رہے ہیں؟ اور اگر رہے ہیں تو کب سے؟ تاریخ شاہد ہے کہ مسلم دور حکومت میں برہمن کبھی بھی مسلم مخالف نہیں رہے۔ مسلمانوں کے بارے میں ان میں عناد کا یہ جذبہ اچانک 1893ء سے پیدا ہونا شروع ہوا، جس سے ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات کی تاریخ

*مشہور و معروف آئی۔ پی۔ ایس۔ جن کی کتاب "کرکرے کا قاتل کون؟" سے یہ مضمون ماخوذ ہے۔

کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ تقریباً سات سو سال تک ہندوستان پر مسلم حکمرانوں نے راج کیا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلم دور حکمرانی میں ہندوستانی معاشرے پر برہمنوں کی گرفت اور دبدبہ دور حاضر سے کہیں زیادہ تھا۔ سیدھے سادے عام ہندو پوری طرح ان کے سحر میں گرفتار تھے اور برہمن جو کچھ چاہتے تھے ان سے کرا لیتے تھے۔ اس دور میں اگر برہمن مسلم حکمرانوں کے معاون و مددگار نہ ہوتے، بلکہ مخالف ہوتے، تو وہ ان کو سات صدی تو دور ایک سال بھی ہندو عوام پر حکومت نہ کرنے دیتے۔ اس دور کی پوری تاریخ چھان ڈالئے اس میں کوئی ایک بھی واقعہ ایسا نہیں ملے گا کہ برہمنوں نے عام ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف 'بیدار' کرنے کی کوشش کی ہو یا کسی مسلم حکمراں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے کوئی ڈھکی یا چھپی کوشش کی ہو۔ اس کے برخلاف اس دور کی تاریخ میں جا بجا ایسی مثالیں موجود ہیں کہ برہمنوں نے مسلمانوں کو حکومت اور انتظامیہ چلانے میں سرگرمی کے ساتھ تعاون دیا اور اس بات کو یقینی بنایا کہ ان کی حکومت بخیر و خوبی چلتی رہے۔ مغل بادشاہ اکبر کے 'نورتنوں' میں کئی برہمن شامل تھے۔ ٹیپو سلطان کے خاص مشیروں اور اعلیٰ انتظامی افسران میں بھی برہمن کلیدی عہدوں پر فائز تھے۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب عالمگیر کے دربار میں بھی (جن کو موجودہ دور کے مخصوص برہمنی عناصر فرقہ وارانہ منافرت بھڑکانے کے لئے خاص کر بدنام کرتے ہیں) 50 فیصد سے زیادہ وزیر برہمن تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ برہمنوں کی سرگرم تائید و حمایت کی بدولت ہی مسلمان سات سو سال تک آرام کے ساتھ حکومت کر سکے۔ مغل حکمرانوں میں اکبر اور اورنگ زیب کے دور حکومت تو پچاس پچاس سال کے ہیں۔ اتنی طویل مدت تک حکمرانی برہمنوں کی رضامندی اور رغبت کے بغیر ممکن نہ تھی۔ اجمالی طور پر جو بات کہی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ عہد وسطیٰ میں برہمنوں کے مراسم مسلمانوں کے ساتھ نہایت خوشگوار رہے۔ اس پس منظر میں آر ایس ایس کے سابق سر سنگھ چالک ایم ایس گولوالکر کا اپنی کتاب We or Our Naitonhood Defined میں یہ دعویٰ کھلی دروغ گوئی ہے کہ: "اس منحوس دن سے جب پہلی بار مسلمان ہندوستان میں اترے، 'ہندو راشٹر' پوری جانبازی کے ساتھ ان لٹیروں کو شکست دینے کے لئے برسرپیکار ہے"۔ تاہم 'ہندو راشٹر' کی ان کی تعریف میں اگر برہمن شامل نہ ہوں تو بات دیگر ہے۔

یہی صورت حال ان علاقوں میں بھی تھی جہاں غیر مسلم حکمراں تھے۔ مثلاً پونا میں برہمن 'پیشوا' حکمرانوں کے دور کی تاریخ میں، جو 1818ء میں ختم ہوتا ہے، ایک بھی ہندو مسلم تصادم کا ذکر نہیں ملتا۔ جب کہ اس برہمنی ریاست میں مسلم آبادی کا تناسب 30 فیصد سے زیادہ تھا۔ پیشواؤں کی حکومت میں

اگرچہ ہندو دلتوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ تھوکنے کے لئے مٹی کا ایک برتن اپنی گردن میں ڈالے رہیں اور اپنے پیچھے ایک بڑی سی جھاڑو لٹکائے رہیں تاکہ زمین پر پڑنے والے ان کے قدموں کے ناپاک نشان ساتھ ساتھ مٹتے چلے جائیں لیکن مسلمانوں کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے دوران، جو عام ہندوؤں، برہمنوں اور مسلمانوں نے مل کر لڑی تھی، اتفاق رائے سے بہادر شاہ ظفر کو قائد چنا گیا تھا، حالانکہ وہ صرف نام کے شاہ رہ گئے تھے۔ مختصر یہ کہ انیسویں صدی کے نصف اول تک ہی نہیں بلکہ اس کے بعد تک مسلمانوں اور برہمنوں کے تعلقات بہت ہی خوشگوار رہے اور اس وقت تک برہمن مسلم حکمرانوں کے خلاف نہیں تھے۔ اس کے بعد فطری طور سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں برہمن مسلم مخالف کیوں ہو گئے؟ اس ذیل میں 1893 بڑی اہمیت کا حامل ہے، اسی سال ملک میں پہلے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

1893 سے اب تک کے فسادات کی تاریخ اور گزشتہ چند سال کے دوران دہشت گردی کے حقیقی اور مصنوعی دونوں طرح کے واقعات کو سمجھنے کے لئے ہمیں 19ویں صدی کی اس اصلاحی تحریک کو سمجھنا ہوگا، جو برہمنی نظریہ پر قائم سماجی نظام کو بدلنے کے لئے وجود میں آئی اور جس نے پورے ملک خاص طور سے مہاراشٹر اور بعض دوسری جنوبی ریاستوں میں جلد ہی اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔

اصلاحی تحریک سے توجہ ہٹانے کے لئے مسلمانوں کا استعمال

ایک طویل مدت سے، برہمن ہندوستان کی معاشرتی زندگی میں بلا شرکت غیرے بالادست رہے ہیں۔ ماضی میں جب بھی ان کی اس حیثیت کے لئے کوئی خطرہ پیدا ہوا، انہوں نے وقت اور موقع کی مناسبت سے تدبیریں اختیار کیں۔ مثلاً بودھ بھکشوؤں کو قتل کرا کر اور ان کو ملک چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر کے ملک میں ذات پات کے برہمنی نظام کا از سر نو احیاء کیا، جو بودھ مذہب کے فروغ کی بدولت معدوم ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنے ہی خود نوشت شاستروں میں اپنی تقدیس و عظمت کو اس قدر مبالغے کے ساتھ بیان کیا کہ خود کو معبود کے درجہ تک پہنچا دیا۔ ذات پات کے نظام کو مستحکم کرنے کے لئے منوسمرتی تخلیق کی اور یہ باور کرایا کہ گویا یہ کوئی خدائی نوشتہ ہے۔ معاشرے میں اندھی عقیدت اور توہم پرستی کو فروغ دیا۔ مقامی کشتریہ (کھتری) حکمرانوں کے خلاف بیرونی حملہ آوروں کی مدد کی تاکہ ہندو کشتریوں کی سیاسی طاقت کو توڑا جا سکے۔ انہوں نے بدنیتی کے ساتھ ایسی غلط اور بے بنیاد تاریخ گھڑی جس سے ان کی اپنی اغراض کی تکمیل ہو۔ ان سب تدابیر کا مقصود اپنے مخالفین کو کمزور کرنا اور

معاشرے پر اپنی گرفت کو برقرار رکھنا تھا۔ انھوں نے عہد وسطیٰ میں مغلیہ دور حکومت میں اور اس کے بعد برطانوی سامراج میں اسی چال سے کام لے کر معاشرے پر اپنی گرفت برقرار رکھی۔ لیکن انیسویں صدی کے نصف آخر میں پونہ (مہاراشٹر) میں جیوتی راؤ پھولے نے، جن کو بعد میں 'مہاتما' کا خطاب دیا گیا، قدیم زمانے سے جاری اس برہمنی مکاری پر پہلی کاری ضرب لگائی۔ انہوں نے عام ہندو، پس ماندہ طبقوں اور لڑکیوں کے لیے، جن کو برہمنی نظام میں عصری روشنی سے یکسر محروم رکھا گیا تھا، جگہ جگہ تعلیمی ادارے قائم کیے۔ ایسی کتابیں لکھیں، ایسے گیت اور ڈرامے تخلیق کیے، جن کی بدولت ہندو عوام کی آنکھیں کھل گئیں اور ان میں بیداری پیدا ہوئی۔ انہوں نے ہندو عوام کو یہ احساس دلایا کہ کس طرح برہمن واد کے علم برداروں نے ہزارہا سال سے ان کو عملاً اپنا غلام بنا رکھا ہے اور کس طرح وہ کاشت کاروں، دست کاروں، دلتوں اور عورت ذات پر مسلط مصیبتوں، بدحالیوں اور ذلتوں کے اصلاً ذمہ دار ہیں اور کس طرح عوام کا تعلیمی، اقتصادی اور ذہنی استحصال کر کے مٹھی بھر برہمن باقی معاشرے کی گردنوں پر سوار ہو کر خود ہر میدان میں بڑھتے اور پھلتے پھولتے رہے ہیں۔ مہاتما جیوتی راؤ پھولے کی اس تحریک کی بدولت ہندو معاشرے میں بیداری کی ایک زبردست لہر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس تحریک اور عوام میں اس کی زبردست مقبولیت سے متاثر ہو کر کولہاپور (مہاراشٹر) کے مہاراجہ شاہو جی اور بڑودہ (جو اب گجرات میں ہے) کے مہاراجہ سیاجی راؤ گائکواڑ نے بھی بعض مثبت اقدامات کیے۔ ان حکمرانوں نے مہاتما جیوتی راؤ پھولے کی تعلیمات کے بل بوتے پر اپنی اپنی ریاستوں میں برہمنی سحر کو توڑنے کے لیے کچھ معاشرتی تجربے بھی کیے۔ تقریباً اسی دوران جنوبی ہند میں راما سوامی پیریار (Rama Swamy Periyar) اور نارائن گرو جیسے اصلاح پسندوں نے بھی اسی طرح کی رد عمل تحریکیں شروع کیں۔ انیسویں صدی کے آخر تک مہاراشٹر اور بعض جنوبی ریاستوں میں یہ تحریکیں کافی زور پکڑ چکی تھیں اور ملک کے دیگر حصوں میں بھی ان کے اثرات نظر آنے لگے تھے۔

یہ نئی صورت حال برہمن واد کے لئے سخت تشویش و تردد کا باعث بن گئی۔ اس کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ اگر یہ تحریک پورے ملک میں پھیل گئی اور عام ہندوؤں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ان کی ساری کلفتوں اور محرومیوں کے لئے اصلاً برہمن ہی ذمہ دار ہیں تو وہ ان کو بخشیں گے نہیں اور یقیناً زیادتیوں کا انتقام لینے کے لئے وہ اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اگرچہ برطانوی سامراج میں برہمنوں کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی، لیکن دیر سویر اس کا خاتمہ طے تھا، جس کے بعد انتقام بھڑک اٹھنے کا اندیشہ زیادہ تھا۔ چنانچہ اس بحران پر قابو پانے کے لئے برہمنی لیڈر اور دانشور ایک ایسی حکمت عملی تلاش کرنے میں مصروف

ہو گئے، جس سے عام ہندوؤں کی توجہ ان مظالم کی طویل تاریخ سے ہٹ جائے جن کا وہ برہمن واد کی بدولت شکار رہے ہیں اور سماج پر خود ان کی اپنی بالادستی بدستور قائم رہے۔ چنانچہ پونا کے کچھ برہمن وادی لیڈروں کو ایک انوکھی ترکیب سوجھی، جس سے عام ہندوؤں کی توجہ اس اصلاحی تحریک سے ہٹ جاتی اور اس کے نتیجہ میں وہ انتقام کے اندیشے سے محفوظ ہو جائیں گے۔ وہ انوکھی تدبیر یہ تھی کہ عام ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف ورغلا کر دونوں فرقوں کے درمیان تفریق و تنفر پیدا کر دیا جائے، تاکہ وہ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگیں اور عوام کی توجہ برہمنی مظالم سے ہٹ جائے۔ برہمنی ذہنیت نے اس سازشی منصوبہ کو فوراً قبول کر لیا۔ اس کا پہلا تجربہ پونا میں 1893 میں کیا گیا، جس کے لئے اسی سال بمبئی میں ایک اتفاقیہ واقعہ سے پیدا شدہ کشیدگی کو بہانا بنایا گیا۔ یہ تدبیر اس قدر کارگر رہی کہ اس کے بعد برہمنی عناصر کو اس سلسلے میں مزید سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ فرقہ وارانہ فسادات کا جو سلسلہ 1893 میں شروع ہوا اور جو آج تک جاری ہے، اس برہمنی حکمت عملی کے نتیجے کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا بنیادی مقصد اصلاً اس اصلاحی تحریک سے عوام کی توجہ ہٹانا تھا اور جو ان تعصبات اور زیادتیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے شروع ہوئی تھی جن پر دور قدیم سے برہمنی نظام قائم ہے۔ اس حکمت عملی میں اصل ہدف ہندو عوام رہے ہیں اور مسلمان (اور کچھ خطوں میں عیسائی بھی) اس ہدف کو حاصل کرنے کے لئے محض چارے کے طور پر استعمال کئے جاتے رہے۔

اگرچہ مذکورہ بالا حکمت عملی پر یہ عناصر 1893 سے عمل پیرا رہے ہیں اور وقفہ وقفہ سے فرقہ وارانہ کشیدگی کو ہوا دیتے رہتے ہیں، لیکن وہ پوری طرح سے منظم اور منصوبہ بند نہیں تھے۔ چنانچہ اس حکمت عملی کو منظم طور سے بروئے کار لانے اور برہمنی شورش پسندوں میں ربط و تعاون اور نظم و ضبط قائم کرنے کے لئے 1925 میں رضا کاروں کی ایک تنظیم 'راشٹریہ سویم سیوک سنگھ' (آر ایس ایس) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اپنے مقصود کو حاصل کرنے کے لئے اس نئی تنظیم (آر ایس ایس) کے مفکرین نے دو اہم اداروں، میڈیا اور محکمہ خفیہ کو اپنے زیر اثر لانے کا تہیہ کیا تاکہ وہ رائے عامہ کو حسب ضرورت اپنی حکمت عملی کے مطابق ڈھال سکیں۔ 1947 میں ملک کی آزادی کے وقت تک وہ ان دونوں اہم اداروں میں نفوذ حاصل کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے تھے۔ آزادی کے بعد انہوں نے ان پر اپنے شکنجہ کو اور مضبوط کر لیا اور جب چاہا جہاں چاہا فرقہ وارانہ ماحول بگاڑنے کے لئے ان کا بھرپور استعمال کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عوام کی توجہ ان کے اپنے مسائل سے ہٹ گئی اور برہمنی عناصر اہم سماجی اور ثقافتی اداروں پر اپنی گرفت مضبوط کرنے میں کامیاب ہوتے گئے۔

ہم یہاں صرف ذرائع ابلاغ اور سراغ رسانی کے اداروں کے رول پر گفتگو کریں گے اور یہ دیکھیں

ہے کہ ان کی مدد سے ان عناصر نے کس طرح طاقت حاصل کی اور اپنے سیاسی اور سماجی مفادات کے حصول کے لئے آر ایس ایس نے ان کو کس طرح استعمال کیا ہے۔

برہمن وادیوں کے زیر کنٹرول ذرائع ابلاغ

میڈیا برہمنی طاقتوں کے ہاتھوں میں ایک طاقتور ہتھیار ہے اور وہ اس کا استعمال بہت ہی موثر طریقہ سے کرتے ہیں۔ انہوں نے میڈیا پر شروع میں ہی تقریباً پورا کنٹرول حاصل کر لیا تھا اور اس معاملے میں وہ بہت چوکنے رہتے ہیں۔ وہ میڈیا میں ہر جگہ موجود رہتے ہیں تاہم کوئی یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ ان کا آدمی الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا میں کس جگہ اور کس حیثیت میں موجود ہے اور اصلاً کون اس کو کنٹرول کر رہا ہے۔ وہ ایکٹران کی طرح کام کرتے ہیں جو دکھائی تو کسی کو نہیں دیتا مگر موجود ہر جگہ ہوتا ہے۔ بعض استثنائی صورتوں کے علاوہ قومی اخبارات اور رسائل کہیں سے بھی اٹھا کر پڑھئے، بین السطور سے صاف محسوس ہو جائے گا کہ کوئی برہمن وادی ذہن اس کے پس پشت پر کارفرما ہے۔ یہی صورت حال الیکٹرانک میڈیا کی ہے۔ پارٹی کوئی سی بھی برسراقتدار ہو، یہ طاقتور ہتھیار ہاتھ میں آجانے سے وہ سرکار، سیاسی قیادت، افسران وانتظامیہ، پولیس اور تاجر گھرانوں پر موثر طور سے کنٹرول برقرار رکھتے ہیں۔ میڈیا پر کنٹرول حاصل کر لینے میں ان کی کامیابی کا سبب بڑا منطقی ہے۔ قدیم زمانے سے تعلیم پر برہمنوں نے اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی، لہٰذا قدرتی طور سے شروع سے ہی صحافت میں بھی برہمنوں کا ہی بول بالا رہا۔ لیکن ابتدائی دور میں برہمن صحافی عوام کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی مسائل کو منظر عام پر لانے میں مثبت رول ادا کرتے تھے۔ میڈیا کے ذریعہ وہ ان کے مسائل کو اٹھاتے بھی تھے اور ان کو حل کرانے میں مدد بھی دیتے تھے۔ وہ خود حکمرانوں اور جابر وظالم افسران پر بھی نظر رکھتے تھے اور ان کو ظلم وزیادتیوں سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن انیسویں صدی کی آخری دہائی سے برہمنوں میں ایک مخصوص ذہنیت کے عناصر نے میڈیا پر گرفت حاصل کر لی اور اپنے مخصوص فکر اور ایجنڈے کے تحت عوام کی توجہ اصلاحی تحریکات سے ہٹانے کی غرض سے عام ہندوؤں اور مسلمانوں میں نزاع پیدا کرنے کے لئے اس کا استعمال کرنا شروع کر دیا تاکہ معاشرے پر حسب سابق ان کی گرفت بدستور برقرار رہے، اس کے لئے انہوں نے ملک کی فرقہ وارانہ کشیدگی کو بہانہ بنایا اور گمراہ کن اطلاعات کی مہم چلا کر عام ہندوؤں کو ورغلایا۔ آزادی کے بعد دیسی زبانوں کے اخبارات پر برہمن وادی عناصر نے تقریباً پوری اجارہ داری قائم کر لی۔ اگرچہ اس دور کے آتے آتے کچھ دیگر ذاتوں، برادریوں اور دوسرے نظریات کے حامل صحافی بھی میدان میں آگئے تھے، مگر ان کی تعداد بہت کم تھی چنانچہ وہ ان پر اثر انداز نہیں ہو سکے۔ ان کو معلوم تھا کہ پورا نظام برہمنوں کے ہاتھ میں ہے

اور ان کو اس نظام میں اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے، چاہے ان چاہے برہمنی نظریہ کی پیروی کرنی پڑی۔ اگر کسی نے ان سے جدا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی یا ان کے خلاف کوئی آواز اٹھائی تو اس کو بطور طریقہ سے اصل دھارے سے الگ کر دیا گیا۔

اگرچہ دیسی میڈیا پر برہمنیت کی مکمل اجارہ داری قائم ہو چکی تھی تاہم اصلاح پسندوں، اقلیتوں، عام باشندوں اور سیکولر ذہن رکھنے والوں کے لئے یہ بات باعث اطمینان تھی کہ انگریزی اخبارات کافی حد تک ان کی گرفت سے آزاد تھے اور ان کی آزادی اور غیر جانبداری بدستور برقرار تھی۔ لیکن یہ صورت حال اسی وقت تک رہی جب تک انگریزی اخبارات کے خاص ایڈیشن بڑے بڑے شہروں سے شائع ہوتے رہے۔ جیسے ہی انہوں نے اپنے علاقائی ایڈیشن شائع کرنا شروع کئے، بڑی تعداد میں برہمن وادی عناصر ان میں بھی گھس گئے اور آج صورت حال یہ ہے کہ کیا الیکٹرانک میڈیا اور کیا انگریزی پریس، سب پر ان کا کنٹرول ہے۔ یہی سبب ہے کہ برہمن وادی عناصر جن کے پیچھے میڈیا پوری مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہوئے ہیں، حکومت کے اعلیٰ ترین افسر سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے کارکن تک، سب پر دباؤ ڈالتے ہیں، حتیٰ کہ ان کو بلیک میل تک کرتے ہیں اور تاجروں اور عام لوگوں تک سے وہ اپنا کام نکال لیتے ہیں۔

آئی بی پر آر ایس ایس کا مکمل قبضہ

آئی بی حکومت ہند کا خفیہ معلومات حاصل کرنے کا کلیدی ادارہ ہے۔ اتنا ہی نہیں یہ حکومت کی آنکھ اور کان بھی ہے۔ چنانچہ بالکل شروع سے ہی برہمن وادی عناصر نے اس میں گھسنا شروع کر دیا اور آزادی کے بعد کے دس سال کے مختصر عرصہ میں اس پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا۔ کسی فرقہ پرست تنظیم کے کسی سرکاری ادارے پر منصوبہ بند طریقے سے قابض ہو جانے کی یہ ایک عمدہ مثال ہے۔ انہوں نے یہ سب کچھ کس طرح کیا، یہ مطالعے کا ایک دلچسپ موضوع ہے۔ آئی بی کے افسران اور عملے کے دوسرے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ کچھ تو اس شعبے کے مستقل ملازم ہوتے ہیں اور کچھ ریاستوں سے عارضی طور پر (on deputation) آئی بی میں تعینات ہوتے ہیں۔ عارضی طور پر تعینات ہونے والوں میں زیادہ تر درمیانی یا اعلیٰ درجہ کے افسران ہوتے ہیں۔ ابتدائی مرحلے میں ان برہمن وادی عناصر نے اہم مستقل اسامیوں پر قبضہ جمایا۔ اسی کے ساتھ آر ایس ایس جیسی برہمن وادی تنظیموں نے ریاستوں کے تیز طرار اور نوجوان برہمن افسران کو ترغیب دی کہ وہ ڈیپوٹیشن پر آئی بی میں گھسنے کی کوشش کریں۔ مراٹھی پندرہ روزہ رسالہ 'بہوجن سنگھرش' (۳۰ اپریل ۲۰۰۷) میں شائع ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ "آئی بی کے کلیدی منصوبوں پر آر ایس ایس کے وفاداروں کے تسلط کے بعد انہوں نے یہ طریقہ کار

اختیار کیا کہ خود ریاستوں کے ایسے افسران کی نشان دہی کی جائے، جو ان کی نظر میں آئی بی کے لئے مناسب ہوں چنانچہ ان کو ہی آئی بی میں ڈیپوٹیشن پر لیا جانے لگا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آر ایس ایس کے ہم خیال نوجوان آئی پی ایس افسران اپنی ملازمت کے ابتدائی دور میں ہی آئی بی میں داخل ہونے لگے اور پھر ان کو ۱۵-۱۵، ۲۰-۲۰ سال تک آئی بی میں رہنے کا موقع ملا۔ بعض تو اپنی پوری مدت ملازمت ہی آئی بی میں رہے، مثلاً مہاراشٹر کیڈر کے افسر مسٹر وی جی و یا ملازمت سے اپنی سبکدوشی تک آئی بی میں رہے اور ڈائرکٹر آئی بی کے اعلیٰ ترین منصب تک پہنچے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب وہ آئی بی کے سربراہ تھے، ان کے بھائی ایم جی ویدیا آر ایس ایس کے سربراہ تھے۔ اگر ان آئی پی ایس افسران کی فہرست پر، جو مختلف ریاستوں سے عارضی طور پر آئی بی میں لئے گئے، گہرائی سے غور کیا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ ان میں سے اکثر یا تو آر ایس ایس کے وفادار رہے ہیں یا ان کا آر ایس ایس سے قریبی تعلق رہا ہے اور یا تو انھوں نے آر ایس ایس کی ہدایت پر آئی بی یا 'را' (RAW) میں شمولیت اختیار کی ہے یا پھر ان کو ان تنظیموں میں ان کے ہم خیال افسران نے منتخب کیا ہے تا کہ وہ آر ایس ایس کے ایجنڈے کے نفاذ میں معاون بن سکیں۔ ریکارڈ کے لئے کچھ ایسے افسران بھی آئی بی میں لئے جاتے رہے جن کا تعلق آر ایس ایس سے نہیں رہا، لیکن ان کو مستقل طور سے غیر اہم کام سونپے گئے۔"

آئی بی کے ذریعہ آر ایس ایس کے ایجنڈے کا نفاذ

آئی بی پر عملاً آر ایس ایس کے مکمل تسلط کے بعد اس نے آر ایس ایس ایجنڈے کو بڑی چابک دستی کے ساتھ اس طرح نافذ کرنا شروع کیا جیسے وہ کوئی سرکاری ادارہ نہ ہو بلکہ آر ایس ایس کی کوئی ذیلی تنظیم ہو اور ایک مدت سے وہ آر ایس ایس کو عوام کی نظروں میں ایک قوم پرست تنظیم باور کرانے میں اور بائیں بازو کی تنظیموں کو باغی اور مسلمانوں کو بنیاد پرست دہشت گردوں کے حامی اور قوم مخالف فرقہ باور کرا کر عوام کی نظروں میں مذموم ٹھہرانے کے اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہے۔ اس نے اس کے لئے 'سچ کو دباؤ، جھوٹ کو سچ باور کراؤ' کی پالیسی اختیار کی، جس کے لئے درج ذیل تدابیر اختیار کی گئیں:

(۱) آئی بی نے حکومت کو آر ایس ایس اور اس کی ذیلی تنظیموں کی مفسدانہ سرگرمیوں اور کارگزاریوں سے ہمیشہ اندھیرے میں رکھا۔ مثلاً ان کی فرقہ وارانہ سرگرمیوں، ان کو غیر ممالک سے موصول ہونے والی بھاری بھاری رقموں، سماجی، تعلیمی اور ثقافتی اداروں میں اور سب سے اہم یہ کہ میڈیا میں ان کے نفوذ سے اور فرقہ وارانہ نفرت کے اس زہر سے جو ملک بھر میں وہ اپنی ہزار ہا شاخوں کے ذریعہ پھیلا رہے ہیں، بے خبر رکھا اور آر ایس ایس کو ایک 'قوم

پرست تنظیم' کے طور پر پیش کیا۔ یہ بات ان رپورٹوں کے تجزیہ و مطالعہ سے ظاہر ہو جاتی ہے جو آئی بی نے گزشتہ سالوں میں پیش کی ہیں۔

(۲) آئی بی نے بائیں بازو کی پارٹیوں، سیکولر جماعتوں اور مسلم تنظیموں کے بارے میں ایک بالکل ہی مختلف پالیسی اختیار کی۔ اس نے ان کی سرگرمیوں کے بارے میں انتہائی مبالغہ آمیز یا بے بنیاد رپورٹیں پیش کیں۔ حالانکہ ان کی کوئی بھی سرگرمی، آر ایس ایس اور اس کی ذیلی تنظیموں کی سرگرمیوں کے مقابلہ میں ملک کے لئے کسی درجہ میں بھی ضرر رساں نہیں رہی۔ مرکز میں آنے والی ہر حکومت ان رپورٹوں پر آنکھ بند کرکے اعتماد کرتی رہی اور ان کی بنیاد پر بائیں بازو اور سیکولر تنظیموں کی ان سرگرمیوں تک میں رکاوٹیں کھڑی کرتی رہی، جن پر قانوناً کوئی پابندی نہیں ہے۔ اتنا ہی نہیں، ان کو 'انتہا پسند' یا 'دہشت گرد' قرار دے کر عملاً بے وزن کرتی رہی ہیں۔

آئی بی آر ایس ایس سے زیادہ برہمن وادی ذہنیت کی حامل ہے

کچھ سیاست دانوں کی نئی نسل کی اقتدار کے چاہ کے دباؤ میں اور کچھ اس لئے کہ اپنے برہمنی اصل پر ہندو چہرہ چڑھایا جائے، آر ایس ایس اور اس کے سیاسی بازو بی جے پی کو گزشتہ چند سالوں کے دوران اپنے اصل ایجنڈے کے کچھ حصوں کو معرض التوا میں ڈالنا پڑا، جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ برہمن وادی ایجنڈے کے تئیں ان کا جوش و جذبہ بڑی حد تک کمزور پڑ گیا۔ لیکن آئی بی میں برہمن وادی ذہنیت کا معاملہ ایسا نہیں رہا۔ وہ برابر سنگھ پریوار کے ایجنڈے کو بروئے کار لانے کے لئے مستعد رہے اور نہ صرف یہ کہ پہلے کی طرح اس ایجنڈے پر قائم رہے بلکہ سول انتظامیہ اور حکومت میں روز افزوں اپنے اثر و رسوخ سے حوصلہ پا کر اور بھی بھیانک عزائم کو عملی جامہ پہنانے میں لگ گئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ آئی بی نے برہمن واد کے اصل علمبردار کا رول اختیار کر لیا اور آر ایس ایس کے فکر کی ضامن بن گئی۔ اگر برہمنی ذہنیت کے آئی بی افسران کی آر ایس ایس ایجنڈے کے تئیں ایسی وفاداری اور پختگی نہ ہوتی تو آر ایس ایس کی اصل روح کب کی فنا ہو چکی ہوتی اور اپنے تمام تر وسائل اور مستحکم تنظیم کے باوجود معاشرے پر وہ ایسی مضبوط گرفت حاصل نہ کر پاتی جیسی کہ اس نے کر لی ہے۔

آر ایس ایس اور آئی بی میں کس قدر ہم آہنگی اور مماثلت ہے، اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے: پروفیسر سید عبدالرحمٰن گیلانی نے، جن کو دہلی ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ دونوں نے، پارلیمنٹ پر دہشت گرد حملے کے الزام سے بری کر دیا تھا، تہلکہ (۲۲ نومبر ۲۰۰۸ء) میں لکھا ہے: 'میں نے انٹلی

جس ایجنسی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر مجھے کبھی ایسا نہیں لگا کہ میں ایک جمہوری ملک کے سرکاری دفتر میں بیٹھا ہوں، بلکہ ہمیشہ محسوس کیا کہ میں آر ایس ایس کے ہیڈ کوارٹر میں بیٹھا ہوں۔"

آئی بی اپنے آپ میں ایک بااختیار ادارہ ہے

مرکز میں یکے بعد دیگرے برسر اقتدار آنے والی حکومتیں کچھ تو خود اپنی سیاسی الجھنوں میں اور کچھ روزمرہ کے سرکاری کام کاج میں اس قدر مصروف رہیں کہ جب تک یہ سمجھ سکتیں کہ آئی بی پر عملاً برہمنی ذہنیت چھائی ہوئی جا رہی ہے، بہت دیر ہو چکی تھی اور جب تک حکومت اس کو سمجھتی آئی بی اپنے لئے ایک ایسا منظم، مستحکم اور مضبوط حصار بنا چکی تھی کہ اس میں دخل دینا کسی سرکار کے لئے ممکن نہیں رہا تھا چنانچہ حکومت کو اس کی بااختیار حیثیت کو تسلیم کرنا پڑا۔ اگرچہ اصولاً آئی بی کا سربراہ مقرر کرنا حکومت کے دائرہ اختیار میں ہے، لیکن عملاً حکومت کے سامنے انتخاب کی شاید ہی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے۔ یہ ایک روایت بن گئی ہے کہ ریٹائر ہونے والا ڈائریکٹر آئی بی، خود اپنا جانشین تجویز کر جاتا ہے اور حکومت اس کو بغیر کوئی سوال کئے قبول کر لیتی ہے۔ چند ایک استثنائی مواقع کو چھوڑ کر اس طریقہ کار پر پابندی سے عمل ہوتا رہا ہے۔ اگر بفرض محال حکومت کوئی ایسا ڈائرکٹر بھی مقرر کر دیتی ہے، جو برہمن وادی عناصر سے ہم آہنگ نہ ہو، تب بھی اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ برہمن وادی عناصر آئی بی میں اس قدر مضبوطی سے اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہیں کہ وہ کسی 'بیرونی' افسر کو آئی بی کے نظام میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں کرنے دیتے۔ اور اگر وہ اپنے موقف پر ڈٹا رہتا ہے اور ان عناصر کے اثر قبول نہیں کرتا تو پھر ایسی صورت حال پیدا کر دی جاتی ہے جو خود اس افسر کے لئے اور حکومت کے لئے باعث خجالت بن جاتی ہے اور اس طرح وہ عناصر اس کو اپنی راہ پر لے آتے ہیں۔

آئی بی مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو کس طرح اپنی گرفت میں رکھتی ہے؟

ہر وزیر اعظم کا روزمرہ کا معمول آئی بی کے ڈائریکٹر کی ملاقات سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۵-۲۰ منٹ کی اس ملاقات کے دوران ڈائریکٹر وزیر اعظم کو گزشتہ ۲۴ گھنٹوں کے دوران رونما ہونے والے اہم واقعات سے مختصراً آگاہ کرتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ آئی بی نے اپنے ذرائع سے جو معلومات حاصل کی ہیں اور ملک کی سیاسی، سماجی اور فرقہ وارانہ صورت حال کا جو اندازہ اس کو اپنی معلومات کی بنا پر ہے، ان کے پیش نظر آئندہ کس طرح کے واقعات پیش آ سکتے ہیں؟ ڈائریکٹر آئی بی وزیر داخلہ کو بھی روزمرہ مختصراً رپورٹ پیش کرتا ہے۔ جب بھی کوئی خفیہ اطلاع ایسی ہوتی ہے جس کا تعلق امور خارجہ یا دفاعی امور

سے ہو تو حسب ضرورت وہ براہ راست متعلقہ وزیر کو بھی رپورٹ دیتا ہے۔ وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کو روزمرہ رپورٹیں پیش کئے جانے کے اس نظام کا آئی بی کے برہمن وادی عناصر پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعض تدبیریں اختیار کر کے بڑی ہوشیاری سے آئی بی کو حکومت اور انتظامیہ کے دوسرے شعبوں کی دسترس سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اس کے لئے جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہ اس طرح ہے:

(۱) 'ٹاپ سیکریٹ انفارمیشن' اور 'خفیہ کارروائی' کا ٹھپہ لگا کر وہ اس بات کو یقینی بنا لیتے ہیں کہ آئی بی کی سرگرمیوں سے متعلق کوئی اطلاع اہم سرکاری محکموں مثلاً وزیر اعظم کا دفتر، وزارت خارجہ اور وزارت دفاع میں ادھر سے ادھر نہ جانے پائے۔

(۲) انہوں نے ریاستی حکومتوں، اعلیٰ سول و پولیس افسروں، حتیٰ کہ عدلیہ تک میں یہ تاثر قائم رکھا ہے کہ آئی بی جو کچھ بھی کرتی ہے وہ ملک کی حفاظت اور وقار کے لئے ہوتا ہے اور اس کی وزیر اعظم کے دفتر سے منظوری حاصل ہوتی ہے۔

(۳) 'پوشیدہ کارروائی'، 'خفیہ کارروائی'، 'انسدادی کارروائی'، 'داخلی سلامتی' اور 'بین الاقوامی تعلقات' وغیرہ جیسی اصطلاحات کو بار بار دہرا کر وہ اپنی تقریباً تمام سرگرمیوں کو صیغہ راز میں رکھتی ہے، جن میں کوئی شفافیت نہیں ہوتی۔

ان تدابیر کی بدولت مرکزی حکومت کے مختلف محکمے، ریاستی حکومتیں، سول پولیس افسران آئی بی کی ہدایات پر اس طرح پوری تندہی سے عمل کرتے ہیں گویا وہ ہدایات آئی بی کی طرف سے نہیں بلکہ اصلاً وزیر اعظم کے دفتر سے موصولہ احکام ہیں۔ وہ اس اندیشے سے کہ کہیں 'انتہائی خفیہ رازدارانہ اطلاع' کسی اور کے ہاتھ میں نہ پڑ جائے، نہ تو آئی بی کی کسی ہدایت کے جواز پر کوئی سوال اٹھاتے ہیں اور نہ وزیر اعظم کے دفتر سے یا وزارت داخلہ یا کسی اور سرکاری اعلیٰ افسر سے اس کی تصدیق و توثیق کرتے ہیں۔ ان کو یہ اندیشہ بھی رہتا ہے کہ اگر انہوں نے آئی بی کی ہدایت پر بے چون و چرا عمل نہ کیا یا اس کی معقولیت یا جواز کی تصدیق چاہی تو آئی بی ان کے خلاف اپنے سکہ بند ہتھیار 'آفیشیل سیکریٹ ایکٹ مجریہ ۱۹۲۳' کے تحت کارروائی نہ کر دے۔ چنانچہ آئی بی کی 'خفیہ کارروائیوں' کا سلسلہ بلا خوف و خطر بغیر کسی دخل اندازی یا رکاوٹ چلتا رہتا ہے۔ 'انتہائی خفیہ' معاملات میں ایک محکمہ سے دوسرے محکمہ میں مراسلت کی عدم موجودگی کی وجہ سے کسی کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کارروائی کو وزیر اعظم کے دفتر سے یا وزارت داخلہ سے منظوری حاصل ہے یا نہیں؟ چنانچہ یہ بعین ممکن ہے کہ وزیر اعظم کے دفتر کو یا وزارت خارجہ کو ان کا علم ہی نہ ہو۔ چنانچہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، آئی بی کی 'صیغہ راز' کی کارروائیوں کا راز اتنے

پردوں کے تہہ میں چھپتا چلا گیا کہ اب یہ بھی مشکوک ہو گیا ہے کہ خود وزیر اعظم یا وزیر داخلہ بھی اس کے اس پردوں کے پار دیکھ سکتے ہیں یا نہیں۔

آئی بی کی دیدہ دلیری

آئی بی میں برہمن وادی ذہنیت کے فرقہ پرستانہ نظریہ کا اس سے بہتر اور کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا کہ اس ادارے میں 1993 تک ایک بھی مسلمان افسر نہیں تھا (کمیونلزم کمبیٹ، ستمبر 1993، دی ٹیلی گراف، کلکتہ، 18 مارچ 1994 دی سنڈے، 17 مارچ تا 2 اپریل 1994)۔ اگرچہ 1993 کے بعد محض خانہ پری کے لئے چند مسلم افسران کو بھی آئی بی میں لیا گیا اور چند کا تقرر عارضی طور پر ریاستوں سے کیا گیا، لیکن یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے ساتھ کس طرح کا رویہ اختیار کیا گیا ہوگا اور ان پر کتنا اعتماد کیا گیا ہوگا۔ خصوصاً آئی. بی. کے برہمن وادی افسران کی اس دیدہ دلیری کے پیش نظر کہ وہ مسلمان ہوم سکریٹری تک کو اپنی سرگرمیوں کی رپورٹ دینے سے گریز کرتے تھے۔ جب کہ آئی بی کا محکمہ براہ راست ہوم سکریٹری کے تحت آتا ہے۔ ایک ریٹائرڈ ڈی جی پی، مسٹر کے. ایس. ابراہیم نے مسلم انڈیا کے نومبر ۲۰۰۸ کے شمارے میں شائع شدہ اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے: "ایک سابق یونین ہوم سکریٹری نے، جو اس منصب پر فائز ہونے والے پہلے مسلمان ہیں، ایک مرتبہ مجھ سے شکایت کی کہ آئی بی اپنی رپورٹیں ان کو نہیں دکھاتی۔ جب کہ وہ آئی بی کے باضابطہ افسر اعلیٰ ہیں۔"

آئی بی میں برہمن وادی افسران مفتی سعید کے ساتھ، جب وہ مرکزی وزیر داخلہ تھے، کس طرح کا رویہ رکھتے تھے، یہ واضح نہیں ہے۔ لیکن غالباً وہ مسٹر سعید کو نظر انداز نہیں کر سکتے ہوں گے، کیوں کہ اس وقت کے وزیر اعظم (وی پی سنگھ) ان افسران کی جنم پتری سے اسی طرح واقف تھے جس طرح اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کی لکیروں سے۔ چنانچہ ان کو ورغلانا ان کے بس کی بات نہیں رہی ہوگی۔ ان کے دور حکومت میں آئی بی نے اپنی سرگرمیوں کو محدود کر لیا ہوگا اور جیسے ہی سرکار بدلی، اسپرنگ دار گڑیا کی طرح اس کی سرگرمیوں میں ایک دم اچھال آ گیا۔

حکومت آئی بی کے پھندے میں

مراٹھی پندرہ روزہ پہوجن سنگھرش (۳۰ مئی ۲۰۰۸ء) نے لکھا ہے:

"اس طرح کی صورت حال کیسے پیدا ہوگئی اور کیوں آئی بی، پاکستان کی آئی ایس آئی کی طرح پچھلے چند سالوں میں اس قدر طاقتور بن گئی کہ نہ صرف یہ کہ حکومت کو اپنی مرضی پر نچائے بلکہ بسا اوقات اس کے لیڈروں کو بلیک میل بھی کرلے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں اس وقت کے وزیر اعظم اور داخلہ سکریٹری نے آئی بی کو یہ چھوٹ دے

دی کہ وہ متعدد حساس معاملات میں بغیر ریکارڈ پر لائے خفیہ جانچ کرے اور بعض مشتبہ لوگوں کے ٹیلی فونوں پر خفیہ طور سے نظر رکھے۔ آئی بی کے افسران سرکار کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئے کہ اگر فون باضابطہ طور پر ٹیپ کئے گئے یا ان حساس معاملات میں ضابطوں کے تحت جانچ کی گئی، تو بات بگڑ جانے اور اہم راز فاش ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس طرح وہ خفیہ طور پر فون ٹیپ کرنے اور جانچ کرنے کا بے جا غیر قانونی اختیار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ آئی بی نے اپنی ہی ذہنیت کے افسران کے تقررات محکمہ ٹیلی فون کے کلیدی منصبوں پر کرا کر اس طریقہ کار کو مستقل کر لیا اور غیر قانونی طور پر فون ٹیپ کرنے کو ایک معمول بنا لیا۔ یہ معلوم نہیں کہ بعد میں آنے والی حکومتوں سے آئی بی نے اس غیر قانونی کارروائی کی باضابطہ اجازت حاصل کی یا نہیں، یہ بات ان کے علم میں آئی بھی یا نہیں۔ البتہ آئی بی کا آج بھی اس پر بدستور عمل جاری ہے۔ جس سرکار نے آئی بی کو یہ غیر قانونی اجازت دی تھی، اس کو شاید اس بات کا احساس تک نہیں تھا کہ وہ آئی بی کے ہاتھ دو دھاری تلوار دے رہی ہے، جس کو خود اس کے خلاف بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس طریقہ کار کے نتائج انتہائی سنگین ہو سکتے ہیں اور محکمہ ٹیلی فون میں آر ایس ایس کے ایک وفادار کو بٹھا کر کسی بھی شخص کی، چاہے وہ کسی بھی حیثیت کا حامل ہو، فون پر بات چیت کو سنا جا سکتا ہے اور اس کو بلیک میل کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح حکومت خود ساختہ پھندے میں پھنس گئی ہے۔

حکومت کے پاس معلومات حاصل کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ آئی بی جو کچھ بھی اطلاعات فراہم کرتی ہے، اس کو مقدس صحیفے کی طرح بغیر جانچے پرکھے، جوں کا توں قبول کر لیتی ہے۔ گویا سرکار یہ سمجھتی ہے کہ آئی بی سب کچھ جانتی اور سمجھتی ہے۔ مگر اس کو یہ خیال نہیں آتا کہ وقت کے ساتھ ساتھ آئی بی طاقت کا سب سے مخفوظ محور بن گئی ہے اور سرکار کے تمام اہم شعبوں کو اپنے اشاروں پر نچا رہی ہے اور ان کو اپنے خاص مقصد یعنی برہمن وادی نظریہ کے حاملین کو استحکام فراہم کرنے کے لئے استعمال بھی کر رہی ہے۔ مختصراً یہ کہ آئی بی ایک ایسا کثیر سروں والا دیو بن گئی ہے جو پاکستانی آئی ایس آئی کی طرح اپنے آقاؤں کو بھی نگل سکتی ہے۔

آر ایس ایس اور دوسری برہمن وادی تنظیمیں مضبوط ہوئیں

میڈیا میں قابل لحاظ حصہ اور آئی بی کے دو موثر ہتھیار ہاتھ میں آ جانے سے آر ایس ایس نے ایک مختصری مدت میں ملک کے طول و عرض میں اپنے ہاتھ پیر پھیلا لیے۔ آج ملک بھر میں اس کی ۴۳ ہزار

شاکھائیں ہیں، جو ۳۰ ہزار سے زیادہ شہروں اور قصبوں میں سرگرم ہیں۔ تاہم اس کے رضا کاروں کی اصل تعداد معلوم نہیں۔ یہ تعداد ۷۰-۸۰ لاکھ کے آس پاس ہو سکتی ہے۔ معروف مصنفہ ارندھتی رائے (Arundhati Roy) نے اپنے مضمون '9 is not 11 and November is not September' میں لکھا ہے: "آر ایس ایس کی ۴۵ ہزار شاکھائیں ہیں۔ اس کی خود کی ذیلی تنظیمیں اور ستر لاکھ والینٹر ملک بھر میں اس کے منافرانہ نظریات پھیلانے میں مصروف ہیں" (آؤٹ لک: ۲۲ دسمبر ۲۰۰۸ء) اس کی ذیلی تنظیموں کی ایک طویل فہرست ہے جن کے مقاصد بظاہر بے ضرر ہیں۔ ان میں سے چند معروف تنظیمیں اور ان کے بیان کردہ مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

شمار نمبر	ذیلی تنظیم کا نام	اعلان کردہ/تفویض کردہ مقاصد یا کام
۱.	ہندو جاگرن منچ	احتجاجی بازو
۲.	بجرنگ دل	احتجاجی بازو
۳.	بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی)	سیاسی بازو
۴.	اے بی وی پی	شعبہ طلبہ
۵.	ودیا بھارتی	تعلیمی شعبہ جس میں ۱۳ ہزار تعلیمی ادارے، ستر ہزار اساتذہ اور ایک کروڑ ستر لاکھ طلبہ ہیں۔
۶.	اکھل بھارتیہ گرامک پنچایت	صارفین تحریک
۷.	ون واسی کلیان آشرم	قبائلی بہبود کی تنظیم
۸.	اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد	ادبی محاذ
۹.	پرگیہ بھارتی	نظریہ ساز ادارہ
۱۰.	دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ	تحقیق
۱۱.	بھارتیہ اتہاس سنکلن یوجنا	تاریخ میں تحقیق
۱۲.	سنسکرت بھارتی	لسانی ادارہ
۱۳.	سیوا بھارتی	سلم باشندگان کی بہبود کا شعبہ
۱۴.	ہندو سیوا پرتشٹھان	فلاحی تنظیم
۱۵.	سوامی وویکانند میڈیکل مشن	صحت عامہ
۱۶.	راشٹریہ چکتسک سنگھ	اطباء کی تنظیم
۱۷.	بھارتیہ کشٹھ نوارن سنگھ	جذام کے مریضوں کی خدمت کا ادارہ
۱۸.	سہکار بھارتی	کوآپریٹو تحریک
۱۹.	بھارت پرکاشن	طباعت اور نشر و اشاعت کا ادارہ
۲۰.	سروچی پرکاشن	طباعت اور نشر و اشاعت کا ادارہ
۲۱.	لوک ہت پرکاشن	طباعت اور نشر و اشاعت کا ادارہ
۲۲.	گیان گنگا پرکاشن	طباعت اور نشر و اشاعت کا ادارہ
۲۳.	ارچنا پرکاشن	طباعت اور نشر و اشاعت کا ادارہ
۲۴.	بھارتیہ وچار سادھنا	طباعت اور نشر و اشاعت کا ادارہ
۲۵.	سادھنا پستک	طباعت اور نشر و اشاعت کا ادارہ
۲۶.	آکاشوانی سادھنا	طباعت اور نشر و اشاعت کا ادارہ
۲۷.	ساماجک سمرستا منچ	معاشرتی میل ملاپ کا شعبہ
۲۸.	وشو ہندو پریشد	مذہبی شعبہ
۲۹.	وویکانند کیندر	شعبہ فلسفہ

آر ایس ایس اور اس کی فرقہ پرست و تشدد پسند معاون تنظیموں وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اور ہندو جاگرن منچ وغیرہ اگرچہ دعویٰ تو یہ کرتی ہیں کہ ان کا مقصد ملک کو ایک 'ہندو راشٹر' میں تبدیل کرنا ہے، لیکن ان کا اصل ارادہ 'برہمنی راشٹر' قائم کرنے کا ہے اور وہ نہ صرف یہ کہ ملک کے مذہبی اور سماجی شعبوں میں بلکہ سیاسی میدان میں بھی برہمن وادکا بول بالا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر اور ہندو عوام کی توجہ اصلاحی تحریکات سے اور ان مظالم کی تاریخ سے ہٹانے کے لئے جن کا شکار عام ہندو برہمنی نظام کے تحت صدیوں سے رہے ہیں، وہ عام ہندوؤں اور اقلیتوں میں فرقہ وارانہ تفریق پھیلاتے رہتے ہیں اور ساتھ ہی بالواسطہ طور سے عام ہندوؤں اور دلتوں میں بھی تفریق کو ہوا دیتے ہیں۔ آر ایس ایس کی شاکھاؤں میں کم عمری سے ہی اچھی طرح سے سکھائے پڑھائے اور تربیت یافتہ 'سوئم سیوک' سیدھے سادھے ہندو لڑکوں اور لڑکیوں کے ذہنوں میں اقلیتوں، خصوصاً مسلمانوں اور عیسائیوں کے خلاف مسلسل زہر گھولتے رہنے کے لئے تاریخی واقعات کو مسخ کر کے سناتے ہیں۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اور بعض علاقوں میں عیسائیوں کے خلاف افواہیں پھیلاتے ہیں اور فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ مذہبی تقریبات، جلسے، جلوس، جن میں بڑی تعداد میں لوگ جمع ہوتے ہیں، ان کے لئے شر انگیزی کے بہترین مواقع ہوتے ہیں۔

نوجوان 'سوئم سیوکوں' کے علاوہ دوسرے ہم خیال دانشور، پیشہ ور افراد، تاریخ داں، اہل قلم، ڈرامہ

فوجیں، صحافی یہاں تک کہ سرکاری ملازمین بھی، اپنے اپنے شعبوں اور حلقوں میں فرقہ وارانہ فضا کو مسموم کرتے رہتے ہیں اور حسب موقع نہایت اعتماد کے ساتھ برہمنی روایات کے گن گاتے رہتے ہیں۔ کوئی بھی موقع کیوں نہ ہو، سفر ہو، کوئی تقریب ہو، کوئی پارٹی ہو، پکے متعصب کہیں بھی اپنے متنازع نظریہ کی تشہیر اور مسلم مخالف ماحول بنانے کی سرگرمیوں سے باز نہیں آتے۔

آر ایس ایس اور دوسری برہمن وادی تنظیموں کے ہر وقت فرقہ وارانہ جراثیم پھیلاتے رہنے سے ماحول ہمیشہ کشیدہ رہتا ہے اور ذرا سی چنگاری بھی فرقہ وارانہ تشدد برپا کرانے کے لئے کافی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جو فسادات ہوتے ہیں ان میں عام ہندو، دلت اور مسلمان ہی زد میں آتے ہیں اور بھاری جانی و مالی نقصان اٹھاتے ہیں۔ ان کے خاندان مصائب کا شکار ہوتے ہیں، ان کے بچوں کو پولیس اپنے چنگل میں پھنسا کر مقدموں میں الجھا دیتی ہے، اس طرح ان کا مستقبل تباہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ دوسری طرف بے لگام برہمن وادی نظریہ کے تحت کیڈر حاملین، جو فساد بھڑکانے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں، فساد بھڑکتے ہی ہندو مسلم نوجوانوں کو رام بھروسے چھوڑ کر چپکے سے کھسک لیتے ہیں اور اس طرح خود ہر طرح کے نقصان سے بچے رہتے ہیں، جب کہ یہ نوجوان پولیس کارروائی کا نشانہ بنتے ہیں اور سالہا سال عدالتوں کے چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آر ایس ایس اور دوسری برہمن وادی تنظیمیں عام ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے میں خوب کامیاب ہیں۔

ہندوستان میں 1883 سے اب تک فرقہ وارانہ فسادات کی تاریخ اس قدر طویل اور پیچیدہ ہے کہ اس سب کو اس ایک کتاب میں تفصیل سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہم مختصراً یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ اپنے اس شیطانی سازشی منصوبے کی بدولت برہمن وادی عناصر اپنے ارادے کے مطابق معاشرے پر مذہبی اور سماجی کنٹرول حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ بہت کچھ حاصل کر لیا ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات: چناو جیتنے کے لئے جادوئی چھڑی

فسادات کی حکمت عملی کے نظریہ سازوں نے تو خواب میں بھی یہ نہ سوچا ہوگا کہ مستقبل میں یہ فسادات برہمن وادی عناصر کے لئے سیاسی طور پر اس قدر سودمند ثابت ہوں گے اور الیکشن جیتنے کے لئے جادو کی چھڑی بن جائیں گے۔ فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں سنگھ پریوار کے ہاتھ میں نہ صرف یہ کہ برہمن واد کے توڑ کے لئے جاری اصلاحی تحریک کے خلاف ایک موثر ہتھیار ہاتھ آ گیا ہے۔ بلکہ الیکشن میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایک جادو کی چھڑی بھی مل گئی ہے۔ جیسے ہی فساد پھوٹ

پڑتا ہے، عام ہندو نوجوان سب کچھ بھول کر ان برہمن وادی طاقتوں کے گرد جمع ہو جاتے ہیں جو ہندو ووٹ کا مسودا لگائے ہوتی ہیں۔ اس طرح چاہے کسی خطے میں اصلاحی تحریک 80% تک بھی کامیابی سے ہم کنار کیوں نہ ہو گئی ہو، سنگھ پریوار بس ایک فساد بھڑکا کر اس کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتا ہے۔ اس حقیقت کو آر ایس ایس نے بڑی زیرکی کے ساتھ اپنے سیاسی مفاد کے حصول کے لئے استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ کوئی بھی سیکولر تنظیم نہ تو اپنے نظریات پر اس قدر پختگی سے قائم تھی اور نہ آر ایس ایس کی طرح پرعزم تھی کہ نظریاتی یا سیاسی طور سے اس کی چالوں کا توڑ کرتی۔ اس لئے فسادات کے شیرازے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا سیاسی بازو یعنی بی جے پی کئی ریاستوں میں برسر اقتدار آ گیا اور بابری مسجد کے انہدام کا پرشور کھیل کھیل کر وہ مرکز میں بھی اقتدار پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن یہ صورت حال زیادہ دن تک چلنے والی نہیں تھی۔ لوگ فسادات کو بھڑکانے میں سنگھ کے کردار اور اس کی بدنیتی کو سمجھنے لگے ہیں، خصوصاً گجرات کے فسادات کے بعد سے سنگھی بری طرح بے نقاب ہو گئے ہیں۔ اس لئے اپنے سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کی غرض سے مسلمانوں کا خوف لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنے کے لئے ان کو متبادل ہتھکنڈے تلاش کرنے کی فوری ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اگرچہ اس حکمت عملی پر یہ عناصر 1893 سے عمل پیرا رہے ہیں اور وقتے وقتے سے فرقہ وارانہ آگ کو ہوا دیتے رہتے ہیں، لیکن وہ پوری طرح سے منظم اور منصوبہ بند نہیں تھے۔ چنانچہ اس حکمت عملی کو منظم طور سے بروئے کار لانے اور برہمنی شورش پسندوں میں ربط و تعاون اور نظم و ضبط قائم کرنے کے لئے 1925 میں رضاکاروں کی ایک تنظیم راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اپنے مقصود کو حاصل کرنے کے لئے اسی نئی تنظیم (آر ایس ایس) نے دو اہم اداروں، میڈیا اور محکمہ خفیہ کو اپنے زیر اثر لانے کا تہیہ کیا تا کہ وہ رائے عامہ کو حسب ضرورت اپنی حکمت عملی کے مطابق ڈھال سکے۔ 1947 میں ملک کی آزادی کے وقت تک وہ ان دونوں اہم اداروں میں نفوذ حاصل کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئی تھی۔ آزادی کے بعد اس نے اپنے شکنجے کو اور مضبوط کر لیا اور اب جب چاہا جہاں چاہا فرقہ وارانہ ماحول بگاڑنے کے لئے ان کا بھرپور استعمال کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عوام کی توجہ ان کے اپنے حقیقی مسائل سے ہٹ گئی اور برہمن وادی عناصر اہم سماجی اور ثقافتی اداروں پر اپنی گرفت مضبوط کرنے میں کامیاب ہوتے گئے۔

☆☆☆

قرآنی اسالیبِ دعوت

مقبول احمد فلاحی

قرآن ہر انسانی روح کی غذا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق فرمائی اور جملہ ضروریات، لوازمات و وسائل سے آراستہ کیا۔ اس نے دنیا میں انسان کو خلیفہ کے مقام پر فائز کیا۔ وسائل کائنات کے درست استعمال کے ذریعہ روئے زمین کی تعمیر و ترقی کے لیے علم کی دولت سے سرفراز فرمایا۔ پھر وسائل کائنات سے پوری طرح مستفید ہوتے، بحیثیت خلیفہ تعمیری کردار ادا کرنے اور درست سمت پر چل کر بہتر نتائج حاصل کرنے کے لیے انبیاء کرام کو بھیجا اور ان پر اپنی کتابیں نازل کیں۔ اللہ کے رسولوں اور ان نازل شدہ کتب سماوی کا مقصد انسان کو انحرافات اور وسائل کائنات کے غلط استعمال سے بچا کر اسے اللہ کی مرضی کے مطابق برتنا اور اپنے ساتھ دوسرے انسانوں کو دنیا اور آخرت کی کامیابی سے ہمکنار کرنا قرار دیا۔

لہٰذا ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ آخری ہدایت نامہ قرآن حکیم سے قربت پیدا کرے، اسے پڑھے سمجھے، عملی زندگی میں نافذ کرے اور حتی المقدور اس نور سے دوسرے انسانوں کی زندگیوں کو منور کرنے کی کوشش کرے۔

قرآن سے استفادہ کا حق ہر انسان کی طرح مجھے بھی حاصل ہے۔ اصلاً اسی جذبہ کے تحت قرآن پاک سے میرا ربط ہے۔ تلاوت آیات کے نتیجہ میں براہ راست میرے قلب و ذہن میں جو احساسات ابھرتے ہیں زیر نظر تحریر میں انہیں محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

قرآنی رموز و اسرار پر دنیا کی ہر زبان میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور تا قیامت لکھا جاتا رہے گا۔ مگر اس بحر بیکراں سے معجزاتی طور پر ہمیشہ لعل و گہر برآمد ہوتے رہیں گے کیونکہ یہ لازوال مالک حقیقی کا ذاتی فیضان ہے۔ اس کی وسعتوں، حکمتوں اور فیض رسانیوں کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔

اپنی کم مائیگی اور کم علمی کا شدت سے احساس ہونے کے باوجود اپنے حاصل مطالعہ کو عام کرنے کی وجہ ایک اندرونی دباؤ ہے جس کی تعبیر میرے لئے محال ہے۔ اسے تحدیث نعمت، ابلاغ آیۂ، امتنان رب کائنات کہئے یا کچھ اور، دراصل حقیقی تعبیر کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ البتہ ایک بات متعین طور پر کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ قرآن کتاب دعوت ہے۔ ھدی للناس ہے۔ عام انسانوں کو سیدھے سادے انداز میں اسے پڑھنا، سمجھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ اس کی تفہیم اس انداز سے ہونی چاہیے جسے معری قرآن کی مانند عوام قبول کرسکیں۔

پوری دنیا کی تقریباً ۹۵ فیصد آبادی قرآن کی زبان میں الناس کے زمرہ میں ہے۔ اس کے سامنے قرآن پیش کرنا ہے کیونکہ لوگوں کو اسلام کی طرف بلانے کا اس سے بہتر اور موثر ذریعہ اور کوئی نہیں ہے، مگر امت مسلمہ کے پاس عوام کے سامنے قرآنی دعوت کو پیش کرنے کے لئے کوئی اطمینان بخش کتاب نہیں ہے۔ مثلاً اسالیب دعوت پر مختلف زبانوں میں کتابوں کی کثیر تعداد ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ خالص غیر مسلمین کو مدنظر رکھ کر کوئی کتاب مرتب نہیں کی گئی ہے یا قرآنی تفسیرات روز اول سے لکھی جارہی ہیں مگر میرے علم کی حد تک صرف غیر مسلم دنیا کے پیش نظر اب تک کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی ہے۔ وغیرہ

اس تجزیہ میں قرآنی اسالیب دعوت پر بحث کی گئی ہے۔ اسالیب دعوت کی جستجو میں یہ بات پوری طرح واضح ہوتی ہے کہ قرآن پورے کا پورا کتاب دعوت ہے اور اس کی ہر ہر آیت میں دعوت دین کے اسالیب موجود ہیں بشرطیکہ داعیانہ نقطہ نظر سے قرآن کا مطالعہ کیا جائے۔ اس تحریر میں قرآنی اسالیب سے مراد چند اہم اور خاص اسالیب ہیں ورنہ دیدۂ بیدار رکھنے والے دیگر بہت سارے اسالیب سے قرآن کے طالب علم کو نواز سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دعوتی نقطہ نظر سے قرآن کی توضیح و تشریح کی جائے۔

قرآنی اسالیب دعوت

(۱) تقویٰ دعوت کا جوہر ہے۔

انسان کو اللہ کی طرف بلانا دعوت ہے۔ اس دعوت پر لبیک کہنے کے لیے انسان کے اندر جس بنیادی جوہر کی موجودگی ضروری ہے اسے تقویٰ کہتے ہیں۔ تقویٰ کی بہت ساری تفصیلات ہیں، ان سب کی اصل یہ ہے کہ بنیادی طور پر انسان کا ضمیر زندہ ہو، قلب آلودگیوں اور گرد و غبار سے پاک ہو، انسانی قلب ہر طرح کے خارجی اثرات سے محفوظ ہو اور سلامتی طبع کے جوہر سے آراستہ ہو۔

جس دل کی یہ کیفیت ہو وہ تقویٰ کا اہل ہے اور اسی زمین پر تقویٰ کی عالیشان عمارت کی تعمیر ممکن ہے۔ لیکن اگر بنیادی طور پر یہ جوہر ہی موجود نہ ہو تو کسی ذریعہ سے بھی انسان کے اندر تقویٰ کی صفات پروان نہیں چڑھائی جا سکتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ "کل مولود یولد علی الفطرة فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ" ہر نومولود دین فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے، اسے اس کے والدین یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

داعی کو پیغام حق پیش کرتے وقت سب سے پہلے اس امر کا جائزہ لینا چاہیے کہ مدعو کی قلبی کیفیت کیا ہے۔ اگر وہ سلیم الطبع ہے تو ان شاء اللہ دعوت حق کی قبولیت اور تقویٰ کے دیگر مراحل طے کرنے میں دشواری پیش نہیں آئے گی لیکن اگر خارجی اسباب و عوامل کے تحت وہ کسی تعصب، تنگ نظری یا قلبی مرض میں مبتلا ہے تو دعوت دینے سے قبل ضروری ہوگا کہ پہلے زمین کو ہموار کیا جائے، قلب کو صاف کیا جائے اور حکمت سے اندرون کے جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کیا جائے۔

الٓمّٓ ۝ ذٰلک الکتاب لا ریب فیہ ھدی للمتقین ۝ (البقرۃ ۲:۱) الف، لام، میم۔ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے متقیوں کے لئے۔ یعنی قرآن متقین کی رہنمائی فرماتا ہے۔ ایسے لوگوں کو راستہ بتاتا اور صراط مستقیم پر آگے بڑھنے میں معاون بنتا ہے جن کے اندر حق پسندی ہے اور قبولیت حق کا بنیادی جوہر موجود ہے۔ اسی جوہر پر ایمان اور عمل صالح کا قصر تعمیر ہوتا ہے۔

(۲) ہدایت و ضلالت کے باب میں قانون الٰہی

انسان کے لئے دو ہی راستے ہیں، یا ہدایت قبول کر کے درست زندگی گزارے یا اسے مسترد کر کے غلط راستے پر ڈالے۔ ان دونوں کیفیات کا مرکز انسان کا قلب ہے۔ ہدایت قبول کرنے کی بنیاد قلب کا اپنی فطرت و سلامتی پر برقرار رہنا اور حق کو قبول کرنے کے لئے صاف و شفاف ہونا ہے۔ درحقیقت یہی قلوب اللہ کی نظر عنایت کے مستحق اور راہ یاب ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ قلوب جو یکے بعد دیگرے مسلسل حق پوشی اور انحرافات کے نتیجے میں سیاہ اور سخت ہو جاتے ہیں، ان کے اندر قبولیت کا جوہر فنا ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ انسانی قلوب پر ان متضاد واردات کو اپنی جانب منسوب کرتا ہے، کہتا ہے میں جسے چاہتا ہوں ہدایت دیتا ہوں اور جسے چاہتا ہوں گمراہ کر دیتا ہوں۔ ہدایت و ضلالت کے بارے میں انسان کس درجے میں مکلف ہے اس کا صحیح علم بھی اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔۔ مشیت یزدی ہر چیز پر غالب ہے۔ انسان کو تفویض کردہ قوت اختیاری اس معاملہ میں کس درجے میں مجرم ہے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

،، ان الذین کفروا سواءٌ علیھم ء انذرتھم ام لم تنذرھم لا یومنون ۝ ختم اللہ علیٰ قلوبھم و علیٰ سمعھم و علی ابصارھم غشاوۃ ولھم عذاب الیم ۝ ،، (البقرۃ ۲: ۷) جن لوگوں نے انکار کی روش اپنالی ہے انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ ان پر کوئی اثر ہونے والا نہیں ہے، ان پر دونوں یکساں ہے۔ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی بصارت پر پردہ پڑ گیا ہے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

(۳) انسان کو اس کے رب کی عبادت کی دعوت دی جائے۔

دعوت کا مخاطب ہر سلیم الطبع انسان ہے۔ اس انسان کو اس پیرائے میں دعوت دی جائے کہ دعوت اسے اپنے قلب کی پکار محسوس ہو۔ بلاشبہ ہر انسان کی متاع گم گشتہ اس کا رب ہے اور اس کا گوہر مقصود اپنے رب سے ملاقات ہے۔ لہٰذا جب اس سے یہ بات کی جاتی ہے کہ لوگو اپنے خالق، مالک، آقا اور پروردگار کی غلامی اختیار کرو، اس کے آگے جھک جاؤ، اپنے اس مالک کی بندگی اختیار کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور جس کے رحم و کرم کے زیر سایہ زندگی گزار رہے ہو۔ تو یہ آواز انسانی قلب کے لئے مانوس آواز ہوتی ہے۔ انسانی قلب و ضمیر کو جس شے کی تلاش ہے جب وہ چیز اسے مل جاتی ہے تو بے ساختہ اور بلاتردد اسے پا لینے کے لئے لپک پڑتا ہے۔

اس موقع پر داعی کو نہایت توجہ اور حد درجہ باریکی سے اس امر کا جائزہ لینا چاہیے کہ یاایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم کے اسلوب میں کہیں کوئی ایسی چیز جگہ نہ بنانے پائے جو انسان اور اس کے رب کے درمیان رکاوٹ بن جائے، جیسے داعی کے اپنے رجحانات، کوئی شخصیت یا جماعت، کسی نوعیت کا گروہی یا قومی تعلق یا کسی نوعیت کی احساس برتری وغیرہ۔ خالص دعوت الی اللہ کے اندر ملاوٹ ہے۔ داعی کے ذاتی میلانات، اغراض و جذبات اکثر اس چشمۂ صافی کو گدلا کر دیتے ہیں اور انسان کی اپنے رب کی طرف لپک متاثر ہو جاتی ہے۔ " یا ایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون" (البقرۃ ۲۱) لوگو بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں ان سب کا خالق ہے تاکہ تم بچ جاؤ۔

(۴) قرآن اللہ کی کتاب ہے

قرآن کا معجزانہ کلام داعی کے لئے بہت موثر ہتھیار ہے۔ ایک حق پسند انسان کے سامنے جب قرآن کو اس حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے بلکہ سارے انسانوں کے مالک و آقا کا اپنا ذاتی کلام ہے تو چونکہ اس ذات اقدس سے عداوت و بغاوت سلامتی طبع کے خلاف ہے اور اس کی طرف لپک انسانی فطرت کی طلب ہے لہٰذا مخاطب سوچنے اور اس کلام معجز کے سامنے سرفگندہ ہو جانے پر اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ داعی کا کام یہ ہے کہ قرآن کو چیلنج کے طور پر انسان کے سامنے پیش کرے اور باور کرائے کہ انسان کے بس میں ہی نہیں ہے کہ قرآن جیسا کلام پیش کر سکے۔ یہ صرف انسانوں کا خالق اور قادر مطلق ہی پیش کر سکتا ہے۔ مخاطب کا دل اگر قرآن کو خالق کا کلام تسلیم کر لے پھر آگے کا معاملہ مخاطب انسان کا اس کے رب سے ہو جاتا ہے۔ وہ قرآن کا انکار کرتے وقت سو بار سوچے گا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کدھر جا رہا ہوں۔ ضمیر اگر زندہ ہے تو پھر قرآن کے آگے سپر ڈال کر اطاعت کی

باگ ڈور اپنے مالک کے حوالے کر دے گا اور ایمان و عمل صالح کے دروازے اس کے لیے کھل جائیں گے۔ ”وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداء کم من دون اللہ ان کنتم صادقین۔“ (البقرہ۲۳) اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے، یہ ہماری ہے یا نہیں تو اس کے مانند ایک ہی سورہ بنا لاؤ، اپنے سارے ہمنواؤں کو بلا لاؤ، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو مدد لے لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔

” افلا یتدبرون القرآن، ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً “ (النساء۸۲) کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔

” وما کان ھذا القرآن ان یفتری۔۔۔ (یونس ۳۸،۳۷) کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ کہو اگر تم اپنے الزام میں سچے ہو تو تم ایک سورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس کو بلا سکتے ہو مدد کے لئے بلا لو۔

،،ام یقولون افترٰہ قل فاتوا بعشر سور۔۔۔ (ھود۱۳) کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟ کہو، یہ بات ہے تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم بنا لاؤ اور اللہ کے سوا اپنی مدد کے لئے جنہیں بھی بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔

،،ام یقولون تقولہ، بل لا یومنون۔ فلیاتوا بحدیث مثلہ ان کانوا صادقین (الطور۳۴،۳۳) کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ اگر یہ اپنے اس قول میں سچے ہیں تو اسی شان کا ایک کلام بنا لائیں۔

(۵)قرآن کی حفاظت اس کے کتاب اللہ ہونے کی دلیل ہے :

انسانی تاریخ میں کوئی بھی کتاب ایسی نہیں ہے جو مصنف کی منشاء کے مطابق اپنی اصل حالت پر موجود ہو۔ یا تو وہ فرسودہ اور از کار رفتہ ہو گئی ہے یا انسانی تحریفات کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہو چکی ہے سوائے قرآن کریم کے۔ اب اگر یہ تخصیص صرف قرآن کو حاصل ہے تو اس کی کوئی تو وجہ ہو گی۔ وہ وجہ یہ ہے کہ قرآن نازل کرنے والے رب نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود لے لی ہے۔ اسلام دشمن طاقتوں نے ہر دور میں خفیہ و اعلانیہ تمام حربے اختیار کر ڈالے مگر کبھی بھی ذرا سی تحریف کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جن کو کتابوں کی دنیا کی معرفت ہے وہ بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ کتابوں کی حفاظت کے لئے ممکنہ تدابیر اختیار کرنے کے باوجود امتداد زمانہ خود انہیں فرسودہ بنا دیتا ہے۔ خود مصنف یا اس کے شاگرد اور پیروکار ہی ان میں رد و بدل کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس کلیہ سے اگر مستثنیٰ ہے تو

صرف قرآن کریم اور یہ اس کی حفاظت و صیانت اس کے مالک کی طرف رہنمائی کے لئے کافی ہے۔ ”انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون ،، (حجر۹) اس ذکر کو ہم ہی نے نازل کیا ہے اور ہم خود ہی اس کے نگہبان ہیں۔

(۶)قرآن گنجینۂ حقائق ہے

کائنات اور اس کی ہر چیز عظیم معجزہ ہے۔ اسی لئے بار بار آفاق و انفس پر تدبر اور تحصیل بصیرت کی تلقین کی جاتی ہے۔ نظام کائنات کی عظمت و موزونیت انسان کی کم مائیگی اور درماندگی کی دلیل ہے۔ اسرار کائنات کی شاہ کلید قرآن کریم ہے۔ موجودات عالم کے رموز و اسرار اس میں سمو دیے گئے ہیں۔ اس طرح ہر زمانے میں انسان کی مادی ضروریات کی تکمیل خزانہ غیب سے ہوتی رہی ہے اور آبادیوں کی بے انتہا کثرت کے باوجود بھی ایسا نہیں ہوا کہ خالق کا خزانہ خالی ہو جائے۔ نظام تقسیم کی وجہ سے اگر کہیں خلل آتا ہو تو انسان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ بقدر ضرورت و برداشت دیتا رہتا ہے۔ اسی طرح انسان اور کائنات کی تمام مخلوقات کی ہر نوع کی ضروریات کی تکمیل کا معدن قرآن کریم ہے۔ مادی، روحانی، علمی، عملی، اول و آخر ظاہر و باطن، قرآن ہر طرح کے خزانوں سے پر ہے۔ بقدر ظرف و تحمل اور حاجت و طلب اس کے رموز و اسرار کھلتے ہیں۔

کائنات کی کسی شے کی حقیقت کی معرفت حاصل کرنے کے لئے قرآن کی طرف رجوع کیا جانا چاہیے، اس بحر بیکراں میں غوطہ زنی ہی سے لعل و گہر کا حصول ممکن ہے۔ اس سے صرف نظر کر کے اندھیروں میں بھٹکنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ”و ان من شیء الا عندنا خزائنہ ، وما ننزلہ الا بقدر معلوم،، (حجر۲۱) کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے ہیں ایک مقرر مقدار میں نازل کرتے ہیں۔

(۷) انسان اپنے آپ کو پہچان

مجد و شرف اور عزت و وقار انسان کی فطری طلب ہے۔ دنیا میں وہ ان کے حصول کی اپنے طور پر کوشش کرتا رہتا ہے مگر سمت سفر درست نہ ہونے کے سبب اکثر اس دولت سے محروم رہتا ہے یا غیر حقیقی کرامت و شرافت کے بھرم میں مبتلا ہو کر کج روی کی زندگی گزارتا ہے۔ لہذا دعوت الی اللہ کا ایک اہم اسلوب یہ ہے کہ انسان کی اس فطری طلب کے رخ کو درست سمت میں مہمیز کیا جائے اور انسان کو اپنے وجود، اپنی بنیاد اور اپنی تخلیقی ماہیت پر غور و فکر کی دعوت دی جائے۔ ” واذ قال ربک للملائکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ۔۔۔ (البقرۃ۳۰) ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا، میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں ۔۔۔۔۔۔

قرآن میں کئی مقامات پر مختلف پیرایوں میں حضرت آدم اور ابلیس کے قصے کو بیان کیا گیا ہے۔ تخلیق انسان کی یہ بنیاد واصل اور انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہے اور تقریباً تمام بڑے مذاہب میں قصۂ آدم وابلیس کے بنیادی تصورات موجود ہیں۔ ان حقائق سے اس انداز میں پردہ اٹھایا جائے کہ انسانی طبیعت یہ بات تسلیم کرلے کہ میرے مالک نے مجھے روئے زمین پر سب سے افضل بنایا ہے، اپنا جانشین اور نائب مقرر کیا ہے، زمین کو وارث اور نگہبان بنایا ہے اور ساری مخلوقات کو میرے لیے مسخر کر دیا ہے۔

اس بنیادی حقیقت کے ادراک سے مشرکانہ تصورات وموہومات سے نجات مل جاتی ہے اور مثبت طور پر اپنے آپ کو پہچان کر منصب خلافت کے تقاضے سمجھتا ہے اور درست لائحہ عمل اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ قصۂ آدم وابلیس کے پیرائے میں انسان کے تخلیق اول کے وقت اور حالات کے پس منظر میں عرفان ذات کی دعوت دی گئی ہے، درست بات ہے، من عرف نفسه فقد عرف ربه۔۔ سورہ آل عمران میں سلسلۂ نبوت کے حوالے سے خودشناسی کی تعلیم دی گئی ہے۔" ان الله اصطفیٰ آدم ونوحاً...... (رکوعات ۲، ۵، ۶) حضرت آدم کے حوالے سے عہد الست کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ آل عمران ہی میں میثاق نبوت کے توسط سے یہی بات ذہن نشین کرائی گئی ہے (۸۱، ۸۲)۔

(۸) نام نہاد بر سر حق طبقات کا تنقیدی تجزیہ

جس ماحول اور معاشرہ میں فریضۂ دعوت ادا کیا جائے گا وہاں پہلے سے کچھ طبقات یا افراد ایسے ملیں گے جن کی فکری، جسمی، مادی، اخلاقی، روحانی، اور مذہبی بالادستی قائم ہوگی اور عوام الناس ان کی بالادستی تسلیم کرتے ہوں گے اور مختلف پیش آمدہ امور ومسائل میں ان کی جانب رجوع کرتے ہوں گے۔ دعوت دین کی بنیاد کلمۂ طیبہ لا الہ الا اللہ پر ہے۔ اس بنیاد کے تحت ایک طرف مثبت انداز سے عبادت رب کی دعوت کا کام انجام دینا ہے، دوسری طرف لا الہ کے تحت موجود معبودان باطل یا بزعم خویش برسرحق مگر اصلاً ناحق افراد اور عناصر کے تصورات، معتقدات، رجحانات، افکار ونظریات اور اعمال واخلاق کا تجزیہ کرکے ان کا کھوکھلا پن اور برسر غلط ہونا ثابت کرنا پڑتا ہے۔ اس تنقید وتجزیہ سے نمایاں طور پر تین فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ عوام الناس کے دل ودماغ میں ان عناصر کے تقدس اور بالادستی کا جو طلسم بیٹھا ہوتا ہے اسے عمل تنقید کے ذریعہ مسمار کیا جاتا ہے۔ لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جن پہ تکیہ کیا جا رہا ہے اور جو لوگ فلاح یاب سمجھے جا رہے ہیں فی الواقع ان کی حقیقت کیا ہے۔ ان کے انداز فکر وعمل میں کیا کیا خرابیاں ہیں۔ یہ تو مختلف حیلوں سے انہیں بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ جب ان کا بھرم کھلے گا۔ کھوکھلا پن ثابت ہوگا تو

ایسے طبقے کی حقیقت سے پردہ اٹھتا جائے گا لوگ ان سے متنفر ہو کر راہ حق کی طرف مائل ہوتے جائیں گے۔

۲۔ مراعات یافتہ یا بزعم خود فلاح یافتہ عناصر میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو جان بوجھ کر غلط کرتے ہیں اور غلطیوں کی امامت کرتے ہیں۔ ان کے سامنے اپنے کالے کرتوت واضح ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے کم ہی امید کی جاسکتی ہے کہ شعوری طور پر یہ بغاوت اور سرکشی کی راہ چھوڑ کر صراط مستقیم کی طرف مائل ہوں گے کیونکہ جن محرکات کے تحت ان عناصر نے موجود نظام فکر وعمل کو اپنے حق میں وضع کیا ہے ان مفادات کو وہ حق اور سچائی کے لیے قربان نہیں کر سکتے۔ مگر اسی طبقے میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو گرچہ سادہ لوحی کی بنا پر ہر لحاظ سے اس طبقہ سے وابستہ ہوتے ہیں مگر یہ لوگ کج فکری اور کج روی کے سرخیل نہیں ہوتے البتہ مراعات یافتہ طبقہ کا فرد ہونے کے ناطے نظام باطل سے استفادہ ضرور کرتے ہیں۔ جب بے لاگ انداز سے احقاق حق اور ابطال باطل کا کام ہوتا ہے تو سادہ لوح افراد کے سامنے اپنے بڑوں کی حقیقت کھل جاتی ہے، اور وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہمارے لوگ کس کس طرح عوام الناس کا استحصال کرتے ہیں، اور کس چالاکی وعیاری کے ساتھ انہیں اور ان جیسے دوسرے انسانوں کو معرفت حق سے محروم کر رکھا ہے۔ کیا کیا جرائم ہیں جو خودساختہ نظام کی آڑ میں انجام دیے جاتے ہیں۔ پھر ان کا ضمیر ان کے اپنے طرز فکر وعمل پر ان کی ملامت کرتا ہے اور ایک مرحلے میں مفادات دنیا کو نظر انداز کرتے ہوئے راہ حق کی طرف اقدام کر جاتے ہیں۔

۳۔ ایک تیسرا فائدہ اس عمل کا یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ حق کے علم بردار بن کر دعوت حق کے لیے سرگرم ہوتے ہیں ان کے سامنے ایک ایسا آئینہ آجاتا ہے جس میں اپنی تصویر دیکھ سکتے ہیں اور جن اعمال کی اصلاح کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اس آئینہ کے ذریعہ خود کو ان خرابیوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں جن میں مبتلا ہو کر دوسرے برسر باطل افراد وگروہ راہ حق سے منحرف ہوتے رہے ہیں۔

اس کے پس منظر میں ہر ملک وگروہ کے حالات جدا جدا ہو سکتے ہیں۔ خرابیاں اور برائیاں بھی الگ الگ نوعیت کی پائی جاسکتی ہیں۔ یہ داعی کا کام ہے کہ دیکھے کہ کس فرد وافراد وقوم یا طبقہ میں کس کس طرح کی برائیاں ہیں اور ان خرابیوں پر تنقیدی نظر کیسے ڈالی جائے کہ مذکورہ بالا تینوں فوائد حاصل ہو سکیں۔

لا الہ یا باطل افکار ونظریات کا تنقید وتجزیہ ایک اہم دعوتی اسلوب ہے اسے انجام دیے بغیر حق کی تخم ریزی یا آبیاری نہیں ہو سکتی ہے۔ بظاہر یہ کڑوا گھونٹ ہے مگر نہایت حکمت اور جرأت کے ساتھ اسے استعمال میں لانا ہی ہوگا۔ یہ نہایت نازک محاذ ہے اس محاذ پر ذرا سی بے احتیاطی سے بڑے نقصان کا اندیشہ رہتا ہے۔ بعض افراد بدک بھی سکتے ہیں۔ سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران اور دیگر کئی سورتوں میں یہود ونصاریٰ پر جو بزعم خود" ابناء الله واحباؤه" تھے ان پر تفصیل کے ساتھ اسی حکمت

کے تحت نظر ڈالی گئی ہے۔ اس تقلید سے عرب اور غیر عرب عوام پر جو ان کا ذہنی تسلط اور فکری بالادستی تھی وہ ختم ہوئی۔ پھر ان کے اندر جو صالح عناصر تھے وہ محاذ حق پر آگئے اور امت مسلمہ کو یہ موقع میسر آیا کہ ان کی سرکشی و بے کرداری کے آئینے میں اپنی تصویر دیکھتی رہے کہ کہیں ہم بھی انھیں امراض خبیثہ میں تو مبتلا نہیں ہو رہے ہیں جن میں امم سابقہ مبتلا ہو کر مغضوب اور ضال ہو چکی ہیں۔

(۹) عمل اور ردعمل

اسلوب دعوت کا ایک اہم باب یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ فریضۂ دعوت کی ادائیگی کے نتیجہ میں انسانی سماج پر اس کا ردعمل کیا ہوتا ہے کیونکہ ردعمل پر آئندہ کے عمل کا انحصار ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں دعوت کے نمایاں طور پر تین طرح کے ردعمل سامنے آتے ہیں۔

۱۔ ایک طبقہ جو سلامتی طبع سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ اس کے لئے پیغام حق اس کے دل کی آواز اور اس کی فطرت کی مانگ ہوتی ہے۔ ذرا سی چنگاری اس کے دل و دماغ کو روشن کر دیتی ہے اور وہ لپک کر جادۂ حق پر آجاتا ہے۔ اسے مومن، مسلم، اور متقی کہہ سکتے ہیں۔

۲۔ دوسرا گروہ وہ ہوتا ہے جس نے اپنے ضمیر کو دبا دیا کہ اس کی آواز کو مردہ کر دیا ہے۔ اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ سلامتی طبع سے محروم اس انسان کے سامنے بھی وہی روشنی پہنچتی ہے مگر دل کا اندھا کچھ نہیں دیکھ پاتا ہے۔ اس کے سمع، بصر اور فواد کی قوت بالکل سلب ہو چکی ہوتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر یک لخت دعوت حق کو ٹھکرا دیتا ہے اور پھر شدت کے ساتھ اس انکار کی روش پر روز بروز سخت ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسے کافر کہتے ہیں۔

۳۔ تیسرا طبقہ وہ ہوتا ہے جس کی حالت بین بین کی ہوتی ہے۔ یعنی مکمل سلامتی طبع بھی نہیں ہوتی اور پوری طرح ختم قلب بھی نہیں ہوا ہوتا ہے۔ اس کا قلب بیمار ہوتا ہے۔ مگر ابھی مردہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اب اگر وہ اپنے علاج پر سنجیدگی سے متوجہ ہو اور اسے معالج بھی صاحب حکمت مل جائے تو دھیرے دھیرے مرض پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ توجہ سے دل کے سیاہ دھبے دھل جاتے ہیں اور بالآخر حق پسندوں کی صف میں جا شامل ہوتا ہے۔ لیکن مریض القلب اگر متوجہ نہ ہو اور مرض بڑھنے دے تو دھیرے دھیرے اس کا دل کافر سے بھی زیادہ سخت اور سیاہ ہو جاتا ہے۔ ان تینوں گروہوں کو ان کی قلبی کیفیات کی بنا پر تقی القلب، ختم القلب، یا مریض القلب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

داعی کو مدعوئین کے ردعمل کا تعین کر کے ہر ایک کے ساتھ الگ الگ معاملہ کرنا ہوگا۔ اگر وہ تقی القلب ہیں تو انھیں تقویٰ کی بنیاد پر اسلامی عقائد و عبادات، تزکیہ و تربیت کے جملہ مراحل سے گزار کر مرد مومن بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ ختم القلوب یعنی گروہ کفار پر زیادہ قوت اور محنت صرف کرنے

کی ضرورت نہیں ہے۔ اتمام حجت کے بعد ان کو ان کے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھنا ہوگا۔ البتہ مریض القلب افراد میں مختلف سطح کے لوگ ہوں گے۔ ایک ایک فرد کے اندر مرض کی شدت اور نوعیت کے اعتبار سے مبنی بر حکمت الگ الگ علاج کرنا ہوگا۔ تاکہ جن کے اندر صحت یابی کا کچھ بھی داعیہ ہو وہ آگے آئیں ورنہ دوسرے راستے پر چلے جائیں۔ (سورۃ البقرۃ آیات ۱ تا ۲۰)

تیسرے گروہ میں کئی طرح کے لوگ ہو سکتے ہیں۔

۱۔ **منافق:** منافقین کی بھی کئی اقسام ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ نفاق کس مرحلہ میں ہے۔ مرض کے اعتبار سے تشخیص اور فیصلہ کرنا ہوگا۔ مرض اگر جڑ پکڑ چکا ہے تو گویا وہ بھی ختم القلوب میں شامل ہو چکے ہیں۔

۲۔ **مشاهد:** عقل و شعور تو رکھتے ہیں لیکن فیصلہ کن مرحلہ میں نہیں پہنچے ہیں یا قوت فیصلہ کے اعتبار سے خام ہیں۔

۳۔ **عوام کالانعام**: یعنی پیچھے چلنے والے لوگ جو اپنی عقل سے نہیں سوچتے یا نہیں سوچ پاتے۔ یہ لوگ اکثر بڑوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ اقتدار وقت کا ساتھ دیتے ہیں۔ روایات، آباء پرستی اور بڑوں کے دام فریب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اصلاً یہ مومن ہیں نہ کافر۔ ایک مرحلے پر اس طبقہ کی اکثریت دائرۂ اسلام میں داخل ہوتی ہے۔ داعی کا اصل میدان یہی طبقہ ہے۔ اس کو مستکبرین سے الگ کرنا، ان کے دام فریب سے نجات دلانا انسانیت کی زبردست خدمت اور عمل دعوت ہے۔

(۱۰) تنقید و تجزیہ کے اصول

باطل افکار و نظریات اور عقائد و اعمال پر تنقیدی نظر ڈالنا دعوت کا لازمہ ہے۔ مگر اس کام کی نزاکت کے پیش نظر قرآن نے کچھ اصول دئے ہیں۔ انھیں ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ فکری، اعتقادی اور نظریاتی انحرافات کی توضیح کرنی چاہئے یعنی یہ کہ جو کردار مخالفین حق یا نام نہاد برسر حق طبقہ کا پایا جاتا ہے، یہ معلوم کرنا چاہئے کہ اس کردار کی اصل وجہ کیا ہے انہوں نے کون کون سے فلسفے ایسے گڑھ لئے ہیں جن کی وجہ سے عملی دنیا میں یہ منفی کردار سامنے آ رہا ہے۔

۲۔ اس طبقہ کے عملی فسادات اور انحرافات کیا ہیں۔ یہ کیا کیا حرکتیں کر رہے ہیں جنہیں سلیم الطبع انسان پسند نہیں کرتا۔ کیا کیا جرائم ان سے صادر ہوئے ہیں یا عملاً ہو رہے ہیں۔ کس کس طرح اس طبقے نے انسانیت کا خون کیا ہے اور عوام الناس کے استحصال کے کیا کیا طریقے اختیار کر رکھے ہیں وغیرہ۔

۳۔ عملی انحرافات اور بداعمالیوں کو اگر اللہ تعالیٰ کے احسانات و انعامات کے تناظر میں پیش کیا جائے تو جرائم کی شناعت اور بڑھ جاتی ہے۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ ان کی کوتاہیوں سے چشم پوشی کرتا رہا

انھیں پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کرتا رہا اور دوسری طرف ان کا حال یہ ہے کہ ذرا بھی شکر کر نعمتوں کی قدر کی بلکہ کجروی میں مزید آگے بڑھتے چلے گئے۔

۴۔ تنقیدی جائزہ کا موثر طریقہ یہ ہے کہ بات خالی تنقیدی نوعیت کی نہ ہو بلکہ تنقید میں بھی ہمدردی اور بہی خواہی کا عنصر غالب ہو کہ شاید کوئی دل بات قبول کرنے پر تیار ہو جائے، لہٰذا مرض بتانے کے ساتھ حکمت سے علاج بھی تجویز کیا جاتا رہے، مرض کے اسباب بھی بتائے جاتے رہیں اور اگر کسی کے اندر شفا کی طلب نظر آئے تو خوبصورت انداز سے دوا کی نشاندہی بھی ہوتی رہے۔

۵۔ تنقید و تجزیہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ گاہے گاہے اصلاح نہ قبول کرنے کے دنیوی و اخروی انجام بد سے بھی چوکنا کیا جاتا رہے۔ ماضی کی نظیریں پیش کی جائیں۔ اللہ کی قدرت اور گرفت کا حوالہ دیا جائے۔ آخرت کی پکڑ سے ڈرایا جائے۔ اس طرح دماغوں کے ساتھ قلوب کو بھی چھیڑا جاتا رہے۔

قرآن میں بنی اسرائیل کا ذکر جہاں جہاں آیا ہے اللہ تعالیٰ نے بڑے حسین اور متوازن طریقے سے ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرہ آیت نمبر ۴۰ تا ۱۲۳ میں تفصیل کے ساتھ ان تمام پہلوؤں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱۱) دعوت مشترک اقدار کے حوالے سے

یہ دعوت دین کا بہت اہم اور مفید اسلوب ہے۔ دعوت اسلامی میں اس کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں۔ یہ مشترک قدریں نظریاتی، عملی اور شخصیاتی ہر طرح کی ہو سکتی ہیں مثلاً نزول قرآن کے وقت اللہ تعالیٰ اور حضرت ابراہیم کے اسمائے گرامی، ان دونوں ناموں پر مشرکین عرب، یہود اور نصاریٰ سب کا اتفاق تھا۔ ان ناموں کو مختلف مواقع پر خوب استعمال کرتے تھے۔ گرچہ عملاً ان ناموں سے وابستہ تصورات وعقائد میں بڑی بے ضابطگیاں پائی جاتی تھیں لہٰذا ان ناموں کے حوالے سے صحیح اور درست تصورات کو ابھارا گیا ہے۔ اسم اللہ کے توسط سے وحدانیت کی دعوت بار بار دی گئی ہے۔ حضرت ابراہیم کے حوالے سے اسلام اور اطاعت کا پیغام متعدد مقام پر دیا گیا ہے۔ گویا یہ باور کرایا گیا ہے کہ تمہارا یہ انداز فکر و عمل درست نہیں ہے کہ حضرت محمد ﷺ کوئی نیا دین پیش کر رہے ہیں، یہ تو وہی سب کچھ ہے جو تمہارے جد امجد حضرت ابراہیم نہ صرف تسلیم کرتے تھے بلکہ اسی دین کے لیے انہوں نے اپنا سب کچھ راہ خدا میں قربان کر دیا تھا اور اسی دین حنیف کی تعلیم حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے بھی دی تھی۔ پھر آخر مخالفت کی کیا بنیاد ہیں۔ یہ تو تمہارے اپنے ہی ہیں۔ یہ تو تمہیں بس تمہارا بھولا ہوا سبق یاد دلا رہے ہیں۔ وغیرہ

آج کے مذاہب نظریات و شخصیات کی تعلیمات سے بھی بہت سی مشترک قدروں کی نشاندہی کی

جاسکتی ہے۔ ہندو مت، سکھ مت، عیسائیت، اور یہودیت وغیرہ سے ان اقدار کو تلاش کرنا اور ان کے حوالے سے دعوت پیش کرنا اہم طریقہ کار ہوگا۔ بعض حضرات نے اس نہج پر گراں قدر کام کیا ہے۔

سورۃ البقرہ آیت نمبر ۱۲۴ تا ۱۴۷ میں یہ اسلوب بہت نمایاں ہے۔ اسی طرح یہودیت اور نصرانیت کے حوالے سے سورۃ آل عمران آیات ۳۱، ۳۲، اور ۶۴ تا ۶۸ وغیرہ کا مطالعہ مفید ہے۔

(۱۲) فلاح و نجات کے ابدی اصول

اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا خالق ہے اور اس سے منسوب تمام چیزوں کی فیض رسانی بھی عام ہے۔ اس کی کتاب، تعلیمات حق سارے انسانوں کے لئے ہیں۔ افراد اور گروہوں کی فلاح و نجات کا انحصار ابدی اصولوں پر ہے۔ جو بھی ایمان لائے اور عمل صالح کرے کامیابی اس کے لئے ہے۔ دعوت کے سلسلے میں اس امر کا شدت کے ساتھ لحاظ ضروری ہے کہ اسلام، تعلیمات اسلام اور دیگر [illegible] کی عمومیت کسی مرحلہ میں متاثر نہ ہونے پائے۔ دنیا کے تمام انسانوں کو یہ پیغام جانا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی خاص نسل، قوم، وطن، یا رنگ سے کوئی سروکار نہیں ہے، اسے تو بس ایمان اور بہترین اعمال مطلوب ہیں۔ اب جو بھی اس پیمانے پر پورا اترے گا وہی کامیاب رہے گا۔ انسانوں کے [illegible] اسلام خواہ قومی، نسلی، لسانی اور وطنی نوعیت کے ہوں خواہ گروہی، فکری اور مذہبی نوعیت کے ان [illegible] نہیں ہے۔ کسی مخصوص گروہ سے وابستگی معیار نجات ہرگز نہیں ہے۔

دعوت دین کے اس اسلوب کا فائدہ یہ ہے کہ پوری دنیائے انسانیت اسے اپنی ضرورت اور اپنی [illegible] سمجھ کر آگے بڑھتی ہے اور راہ نجات سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ انسانوں کے فلاح و خسران کے [illegible] نظاموں میں دبے کچلے اور محروم افراد و طبقات یا مایوسی کا شکار عناصر کے لئے اس اصول [illegible] بڑی کشش ہوتی ہے۔ انہیں ایسا لگنے لگتا ہے کہ اس زمین پر ان کا بھی کوئی مقام ہے اور وہ [illegible] پیروی کر کے افضل و اشرف بن سکتے ہیں۔

یہ پیغام سورۃ البقرہ کی آیت ۶۲ اور دیگر کئی مقامات پر دیا گیا ہے۔

"ان الذین آمنوا والذین هادوا والنصاری والصابئین من آمن بالله والیوم الآخر وعمل صالحا فلهم اجرهم عند ربهم ولا خوف علیهم ولا هم یحزنون" بقرہ ۶۲ (ترجمہ) یقین جانو کہ نبی عربی کے ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی، جو بھی اللہ اور روز آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔

اگر اس اصول کا انطباق کرتے ہوئے انسانی معاشرے یا تاریخ سے نظیریں فراہم کردی جائیں تو

بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اصولوں سے انحراف کے نتیجے میں مختلف قومیں مختلف عذاب سے دوچار ہوئیں اور ان اصولوں کو تسلیم کرنے کے نتیجے میں لوگ انعام سے نوازے جاتے رہے۔ اس سرمدی اصول کے انطباق میں انسانی نظام خارج نہ ہو سکا۔

(۱۳) لینت و قلبی گداز دعوت کا بنیادی سرمایہ ہے

قلب کے تقویٰ پر دعوت دین کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ یہ انسانی قلب کے سوز و گداز اور لینت و انابت کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ اسی کی تحریک پر ایک داعی دعوت پیش کرتا ہے اور مخاطب اسی کے سہارے کلمات دعوت کو سنتا اور قبول کرتا ہے۔ یہ دو طرفہ جذب و انجذاب کا ایک بے مثال عمل ہے۔ اس کے برعکس مختلف اسباب کی بنا پر قلوب سخت ہو جاتے ہیں اور یہ قساوت مختلف افراد میں جدا جدا ہوتی ہے۔ کسی بھی طریقے سے اس سنگلاخ زمین کو نرم کیے بغیر اس پر دعوت کی کھیتی نہیں اگائی جا سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی پاک کتاب اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی تعلیمات میں مختلف پیرایوں میں انسانی قلوب کی ان کیفیات کی نشاندہی فرمائی ہے۔ آیت ذیل میں بنی اسرائیل کے ذیل میں یہی بات ذہن نشین کرائی گئی ہے۔ "ثم قست قلوبکم من بعد ذالک فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ وان من الحجارۃ لما یتفجر منه الانھار وان منھا لما یشقق فیخرج منه الماء، وان منھا لما یھبط من خشیة الله وما الله بغافل عما تعملون (البقرۃ آیت ۷۴) ترجمہ۔ مگر پھر تمہارے دل سخت ہو گئے، پتھروں کی طرح سخت، بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی بڑھے ہوئے، کیونکہ پتھروں میں سے کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں، کوئی پھٹتا ہے اور اس سے پانی نکل آتا ہے، اور کوئی خدا کے خوف سے لرز کر گر بھی پڑتا ہے، اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے۔

یعنی بے کرداریوں کے سبب انسانی قلوب سخت ہو جاتے ہیں جیسے پتھر یا اس سے بھی زیادہ سخت کوئی شے۔ کیونکہ پتھروں سے بھی چشمے ابل پڑتے اور نہریں جاری ہو جاتی ہیں یا کبھی پتھر پھٹ جاتے ہیں اور اس کے اندر سے پانی نکل آتا ہے یا کم از کم پتھر سرنگوں ہو جاتے اور اپنی جگہ سے ڈھلک جاتے ہیں۔ اللہ کی خشیت بہت عظیم شے ہے۔ اللہ کی خشیت کے حوالے سے سنگ دل انسان کو رام کیا جا سکتا ہے۔ ان کے اندر نرمی اور لینت کے جذبات پروان چڑھائے جا سکتے ہیں۔ انسانی قلوب پر دستک دیتے رہنے اور اللہ کی قدرت، عظمت اور اسکی کاریگری کے حوالے سے تقویٰ کے یہ قیمتی جذبات پروان چڑھائے جا سکتے ہیں۔

(۱٤) داعی اعظم ﷺ کا طریقہ، کار

حضرت محمدؐ کی ذات گرامی دنیائے انسانیت کے لئے قدوہ اور اسوہ ہے۔ ایک داعی کو ہر حال ہر وقت اپنے پیش نظر اسوۂ رسولؐ کو رکھنا ہی چاہیے کیونکہ آپ کی مرکزی حیثیت ایک داعی کی ہے اور بلاشبہ

آپؐ نے اپنی پوری زندگی شہادت حق کا فریضہ انجام دینے میں صرف کیا۔ قرآن کریم نے آپؐ کے مشن کو [illegible] پر اس پیرائے میں بیان کیا ہے۔ سورہ بقرہ میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا، ان الفاظ میں مذکور ہے۔ "ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم یتلوا علیھم آیاتک ویعلمھم الکتاب والحکمة ویزکیھم، انک انت العزیز الحکیم (البقرۃ ۱۲۹)" اے رب، ان لوگوں میں خود انہی کے اندر سے ایک رسول اٹھائیو، جو انہیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔

دعائے خلیل کے جواب میں حضور اکرم تشریف لائے اور وہی امور انجام دیئے جن کی دعا کی گئی تھی۔ "ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً منھم یتلوا علیھم آیاته ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین" (آل عمران ۱۶۴، الجمعۃ ۲)۔

وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا، جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے، ان کی زندگیاں سنوارتا ہے، اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

آپ کے طریقہ دعوت کے اجزاء حسب ذیل ہیں۔ (۱) تلاوت آیات (۲) تزکیہ (۳) تعلیم کتاب و حکمت۔ اس طریقہ کار میں بعض کو غیر مسلمین اور بعض کو مسلمانوں کے لئے مخصوص کرنا درست نہیں ہے۔ دراصل ان تینوں کاموں کے مخاطب انسان ہیں، اگر دائرہ اسلام سے باہر ہیں تب بھی یہی اصول اختیار کئے جائیں گے اور اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی انہی طریقوں سے فریضہ دعوت انجام دیا جائے گا۔ البتہ مدعو کی فکری و عملی کیفیت کے اعتبار سے الگ الگ انداز سے ان امور کی تطبیق کی جائے گی۔

تلاوت آیات تو واضح ہے اور سب کے لئے قابل فہم ہے۔ البتہ غیر مسلمین کا تزکیہ یہ ہے کہ ان کے قلوب پر حق پسندی کے خلاف جو دبیز پردے حائل ہیں انہیں کھرچ کر صاف کیا جائے۔ دلوں کی سختی کم کرنے کے لئے ان میں لینت و گداز پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور جس قدر ممکن ہو قلوب کو آلائشوں سے پاک کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسی طرح تعلیم کتاب و حکمت غیر مسلمین کے تناظر میں یہ ہے کہ ان کے سامنے تعلیمات قرآنی کی تشریح اور توضیح کی جائے۔ اس کے فوائد و ثمرات کھولے جائیں، اسے انسانیت کے دنیوی و اخروی فلاح و نجات کے واحد ذریعہ کے طور پر پیش کیا جائے۔

(جاری)

دینی مدارس میں تدریس قرآن کا مطلوبہ منہاج

اعجاز احمد قاسمی*

عنوان کی وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ اولاً دینی مدارس کی خدمات کا اجمالی تذکرہ کیا جائے۔ ثانیاً تدریس قرآن کے سلسلے میں ان کے مناہج کا جائزہ لیا جائے۔ ثالثاً ان مناہج میں پائی جانے والی کمی کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کی تلافی کے لئے کچھ تجاویز اور مشورے پیش کئے جائیں تاکہ تدریس قرآن کا مطلوبہ منہاج ابھر کر سامنے آجائے۔ ذیل کی تحریر میں یہی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اللھم وفقنا لما تحب وترضی۔

دینی مدارس اور ان کی خدمات

برصغیر میں اسلام کی تاریخ جتنی قدیم ہے اتنی ہی قدیم مدارس ومساجد کی تاریخ ہے ابتدا ہندوستان میں دینی مدارس کا فکری نقطہ آغاز انیسویں صدی میں ہوا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۸۳۲ء میں برطانیہ کے مشہور ماہر تعلیم لارڈ میکالے نے ہندوستان کا جائزہ لینے کے بعد جو تعلیمی خاکہ پیش کیا اس کا مقصد خود اس کی زبانی یہ تھا کہ "یہاں ایک ایسی نسل پیدا ہو جو پیدائشی اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر فکر کے اعتبار سے انگریز۔" ۱

چنانچہ اسی خاکے کو سامنے رکھتے ہوئے انگریزی مدارس قائم کئے جانے لگے اس خطرناک صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے علمائے کرام نے دینی مدارس کا جال بچھانا شروع کر دیا جن کے ذریعے مسلمانوں کی نئی نسل کے ایمان وتہذیب کی حفاظت کی جا سکے۔ تحفظ شریعت کا یہی کام آئندہ چل کر تمام مدارس کا مقصد اور نصب العین قرار پایا۔

دینی مدارس کی زریں خدمات کو دیکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ دینی مدارس اسلام اور اسلامی تہذیب وثقافت کے وہ قلعے ہیں جہاں دین وایمان کی اقدار محفوظ ہیں اور جہاں مستقبل کے

* استاذ حدیث وفقہ جامعۃ الفلاح

... ہیں۔ یہ اس روح کا نام ہے جس سے دنیا میں زندگی کی رمق باقی ہے۔ بقول مولانا علی میاں ندوی:

"مدرسہ وہ مقام ہے جہاں آدم گری اور مردم سازی کا کام ہوتا ہے، جہاں دین کے داعی اور اسلام کے سپاہی تیار ہوتے ہیں، مدرسہ عالم اسلام کا بجلی گھر ہے جہاں سے انسانی آبادی میں بجلی تقسیم ہوتی ہے، یہ وہ کارخانہ ہے جہاں سے قلب ونگاہ اور ذہن ودماغ ڈھلتے ہیں۔" ۲

تدریس قرآن کے مناہج

مدارس کی ان عظیم خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے آیئے اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ ان کے نظام تعلیم میں قرآن مجید کو۔ جو تمام علوم وفنون کا سرچشمہ، تمام انسانوں کے لئے کتاب ہدایت اور اہل ایمان کے لئے آخری نسخہ کیمیا ہے۔ کس حد تک جگہ دی گئی ہے، اسے کیا مقام ومرتبہ دیا گیا ہے، اس کی تدریس کو کتنی اہمیت دی گئی ہے؟ اور اس کے لئے کیا مناہج اختیار کئے گئے ہیں؟

ہندوستان میں دینی مدارس بے شمار ہیں ان سب کے نصاب ہائے تعلیم کا جائزہ پیش کرنا اس مختصر مضمون میں انتہائی مشکل ہے اس لئے تجزیہ کے لئے ان چھ مدارس کو منتخب کیا گیا ہے جو فکر ونظر اور نصاب ونہج کے لحاظ سے نمائندہ کی حیثیت کے حامل ہیں۔ ذیل میں بالکل تازہ اور تادم تحریر نافذ العمل نصاب کی روشنی میں جائزہ پیش خدمت ہے۔

وہ مدارس جن کا تجزیہ پیش نظر ہے ان کے نام یہ ہیں:

(۱) دار العلوم دیوبند (۲) ندوۃ العلماء لکھنؤ (۳) مدرسۃ الاصلاح سرائے میر

(۴) جامعۃ الفلاح بلریا گنج (۵) جامعہ اشرفیہ مبارکپور (۶) جامعہ سلفیہ بنارس

تدریس قرآن کا مفہوم

تجزیہ شروع کرنے سے پہلے یہ طے کر لینا ضروری ہے کہ تدریس قرآن کا مفہوم کیا ہے؟ اس کا دائرہ کار کیا ہے؟ قرآن وحدیث کی نصوص مثلاً وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ۳ ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلو علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ۴ پر اگر غائرانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ دو پہلوؤں سے تعلیم قرآن کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔ (۱) تلاوت (۲) تبیین قرآن۔ پھر تلاوت کے دو پہلو ہیں (۱) تجوید وترتیل (ورتل القرآن ترتیلا) (۲) تحفیظ۔ اس طرح مجموعی طور پر تین پہلو ہو جاتے ہیں۔ (۱) تجوید وترتیل (۲) تحفیظ (۳) تبیین وتشریح۔

تجوید وترتیل

ترتیل کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کا واضح طور پر حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے "ورتل القرآن

ترتیلا" ۵ (قرآن کی تلاوت ترتیل کے ساتھ کرو) اس لئے تدریس قرآن کا سب سے پہلا زینہ تجوید کے ساتھ قرآن پڑھنے کا سلیقہ سکھانا ہے۔ قرآن مجید کا نزول عربی زبان میں ہوا ہے اور عربی زبان میں بے حد نزاکت پائی جاتی ہے۔ صحیح مخارج سے حروف کی عدم ادائیگی کی صورت میں ان کے معانی و مطالب یکسر بدل جاتے ہیں، اس لئے تدریس قرآن میں تجوید و ترتیل کا ملحوظ رکھا جانا ناگزیر ہے۔

تحفیظ

ارشاد خداوندی "انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون" ۶ کے تقاضے کے پیش نظر اور نماز جیسی مہتم بالشان عبادت کی ادائیگی اور روزمرہ کی زندگی میں عمومی رہنمائی کے لئے قرآن مجید کے معتدبہ حصے کا حفظ انتہائی ضروری ہے اس لئے تدریس قرآن کے ضمن میں تحفیظ کا بھی بقدر ضرورت اہتمام ہونا چاہئے۔

تبیین و تشریح

قرآن مجید کے معانی و مطالب تک رسائی انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے، یہی نزول قرآن کا مقصد اعلی بھی ہے۔ اس لئے تبیین قرآن کے لئے جتنے معاون وسائل و ذرائع مطلوب ہیں ان کو بروئے کار لاتے ہوئے اس مقصد کے حصول کی کوشش کی جانی چاہئے۔ ۷

البتہ تبیین قرآن کے لئے ضروری ہے کہ اس کے نزول کے مقاصد ثلاثہ اصلیہ کو پیش نظر رکھا جائے جسکی تفصیل شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی بے نظیر تصنیف الفوز الکبیر میں بیان فرمائی ہے۔ جس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

(۱) تہذیب نفوس البشر، یعنی انسان کے نفوس کی تہذیب ہو جس کے نتیجے میں وہ اس قدر پاکیزہ اور صاف ستھرے ہو جائیں کہ تمام اخلاقی اور روحانی ذمہ داریاں انجام دے سکیں جو اللہ رب العزت نے ان کے اوپر عائد کی ہیں۔

(۲) دمغ العقائد الباطلة: یعنی وہ تمام باطل عقائد جو لوگوں (مسلمانوں اور غیر مسلموں) کے ذہنوں میں موجود ہیں، ان سب کی تردید کی جائے۔

(۳) نفی الاعمال الفاسدة: یعنی جو اعمال فاسدہ انسانوں میں رائج ہیں، چاہے ان کی بنیاد کسی غلط عقیدے پر ہو یا نہ ہو، ان اعمال کی غلطی کو واضح کیا جائے اور ان کو مٹانے اور درست کرنے کی کوشش کی جائے ۸

نصاب کا جائزہ

تدریس قرآن کا مفہوم واضح ہو جانے کے بعد اب آیئے دیکھتے ہیں کہ ان مذکورہ بالا مدارس میں

تدریس قرآن کن پہلوؤں سے ہو رہی ہے؟ اس کے لئے کتنا وقت مختص کیا گیا ہے؟ کون سے مضامین منتخب کئے گئے ہیں؟ اس کے لئے کون سے مناہج اور طریقے اختیار کئے گئے ہیں؟ آیا یہ موجودہ حالات کے تناظر میں نفع بخش ہیں یا ان کی افادیت میں واضح کمی آگئی ہے۔

(۱) دار العلوم دیوبند

درجہ	مضامین و مواد	ہفتہ وار گھنٹیاں
سال اول	پارۂ عم حفظ تصحیح مخارج کے ساتھ مشق ربع اول	۲
سال دوم	جمال القرآن مع مشق پارۂ عم آخر کے تین ربع	۶
سال سوم	ترجمہ قرآن کریم سورۂ ق تا آخر	۴
سال چہارم	ترجمہ قرآن کریم سورۂ یوسف سے سورۂ ق تک	۲
سال پنجم	ترجمہ قرآن کریم از ابتداء تا ختم سورۂ ہود	۶
سال ششم	جلالین۔ الفوز الکبیر	۱۲
سال ہفتم	×	
سال ہشتم	×	
تکمیل تفسیر	تفسیر ابن کثیر۔ بیضاوی، مناہل العرفان	

(۲) ندوۃ العلماء لکھنؤ

درجہ	مضامین و مواد	ہفتہ وار گھنٹیاں
درجہ ششم	تجوید حدر کی مشق، یاد کی ہوئی سورتوں کا اعادہ و تجوید	۳
درجہ ہفتم	تجوید۔ مشق تجوید مع ضروری قواعد	۳
درجہ ہشتم	تجوید۔ تسہیل التجوید، مظہر التجوید مع مشق مختلف سورہ	۳
درجہ نہم	×	
درجہ دہم	×	
یازدہم	تجوید (تفصیل مذکور نہیں)	۲
الاولی العالیہ	تفسیر القرآن۔ سورۂ حجر، نحل، عنکبوت، روم، لقمان، سجدہ، سبا، فاطر، یس، صافات، ص، زمر، مومن، حم سجدہ، شوری، زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف	۶
الثانیہ العالیہ	سورۂ مائدہ، انعام، اسراء، کہف، حج، مومنون، نور، فرقان، احزاب، محمد، فتح، حجرات	۵

الثالثۃ العالیۃ	تفسیر سورۂ نساء، انفال، توبہ، ق تا الناس، اصول تفسیر: الفوز الکبیر	۲
الرابعۃ العالیۃ	تفسیر۔سورۂ فاتحہ، بقرہ، آل عمران مراجع (ابن کثیر، کشاف، روح المعانی، احکام القرآن للجصاص، احکام القرآن لابی بکر)	۳
الاولی العلیا	تفسیر ودراست، الکشاف علوم القرآن: کتاب علوم القرآن للمناع، کتاب الاتقان للسیوطی	۹
الثانیۃ العلیا	اعجاز القرآن، اصول التفسیر ومناھجہ، احکام القرآن	۳

(۳) مدرسۃ الاصلاح سرائے میر

الصف الاول	x	
الصف الثانی	x	
الصف الثالث	x	
الصف الرابع	قرآن مجید۔سورۂ حدید تا سورۂ ناس	۲
الصف الخامس	قرآن مجید۔سورۂ سبا تا سورۂ واقعہ	۱۲
الصف السادس	قرآن مجید۔سورۂ اسراء تا سورۂ احزاب	۱۲
الصف السابع	سورۂ انعام تا سورۂ نحل مع مفردات القرآن للفراہیؒ	۱۲
الصف الثامن	قرآن مجید۔ سورۂ فاتحہ تا سورۂ مائدہ مع اسالیب القرآن للفراہیؒ	۱۲

(۴) جامعۃ الفلاح بلریاگنج

عربی اول	x	
عربی دوم	ترجمہ قرآن مجید۔سورۂ الملک تا النبا، مع حفظ سورۂ الناس تا الغاشیہ، اصول تجوید از جمال القرآن	۳
عربی سوم	تفسیر قرآن مجید۔ سورۂ الحدید تا الناس مع حفظ، الصف، الجمعہ، المنافقون، المزمل، المدثر، القیامۃ، الدھر	۶

عربی چہارم (عالمیت سال اول)	تفسیر۔سورۂ سبا تا الواقعہ مع حفظ وتجوید، سورۂ الفتح، الحجرات، ق، الرحمٰن، الواقعہ اصول تفسیر۔مقدمہ اصول تفسیر از ابن تیمیہ	۹
عربی پنجم (عالمیت سال دوم)	تفسیر۔سورۂ مریم تا احزاب، مع حفظ سورۂ مریم، یٰس، سجدہ اصول تفسیر۔مقدمہ نظام القرآن للفراہیؒ	۹
فضیلت سال اول	تفسیر۔سورۂ یونس تا الکہف مع حفظ وتجوید سورۂ یوسف وابراہیم، خصوصی مطالعہ (تفسیر ابن کثیر) علوم القرآن۔ (مطالعہ) مباحث فی علوم القرآن لمناع قطان، الفوز الکبیر للدھلوی	۹
فضیلت سال دوم	تفسیر۔سورۂ المائدۃ تا التوبۃ مع حفظ وتجوید سورۂ التوبہ (خصوصی مطالعہ فتح القدیر) علوم القرآن۔ (مطالعہ) مناھل العرفان فی علوم القرآن، دلائل النظام للفراہی	۹
فضیلت سال سوم	تفسیر۔سورۂ الفاتحہ تا النساء مع حفظ وتجوید الجزء الاول مکمل (خصوصی مطالعہ تفسیر الکشاف) علوم القرآن۔(مطالعہ) الاتقان فی علوم القرآن، اسالیب القرآن للفراہی	۹

(۵) جامعہ اشرفیہ مبارکپور

عربی اول	معرفۃ التجوید مع حفظ پارہ عم با تجوید	۲
عربی دوم	x	
عربی سوم	تجوید۔مصباح التجوید، حدر ترتیل، تدویر، ۵ پارے	۲
عربی چہارم	ترجمہ قرآن۔پ۲۸ تا پ۳۰ تجوید۔فوائد مکیہ، حدر ترتیل	۴
عربی پنجم	ترجمہ قرآن۔سورۂ شعراء تا سورۂ جاثیہ (مطالعہ: تدوین قرآن)	۶
عربی ششم	تفسیر۔جلالین: سورۂ انعام، اصول تفسیر: زبدۃ الاتقان	۲

عربی ہفتم	تفسیر- مدارک شریف، سورۃ کہف تا سورۃ فرقان	۲
عربی ہشتم	تفسیر- بیضاوی شریف	۲
	(مطالعہ: کنزالایمان، سورۃ اعراف تا ختم سورہ یونس)	

(۶) جامعہ سلفیہ بنارس

متوسطہ سال اول	حفظ وترتیل، سورۃ فجر تا الناس	۳
متوسطہ سال دوم	حفظ وترتیل جزء عم نصف اول	۱
متوسطہ سال سوم	حفظ وترتیل- جزء ۲۹ نصف ثانی	۱
	ترجمہ قرآن- جزء ۲۹، ۳۰	
ثانویہ سال اول	حفظ وترتیل- سورۃ ملک تا نوح	۳
	ترجمہ قرآن- شوریٰ تا التحریم	۱
ثانویہ سال دوم	حفظ و تجوید- سورۃ السجدۃ، قٓ، الواقعہ، الجمعہ، المنافقون، الدھر، ضیاء القرآت	۳
	ترجمہ قرآن- سورۃ فرقان تا سورۃ حم السجدۃ	
عالمیت سال اول	تفسیر- جلالین، سورۃ الفاتحۃ تا سورۃ الاعراف	۵
عالمیت سال دوم	تفسیر- تیسیر العلی القدیر، سورۃ الانفال تا سورۃ طٰہٰ	۴
	اصول تفسیر- الفوز الکبیر	۱
فضیلت سال اول	تفسیر- فتح القدیر، سورۃ الانبیاء تا الشعراء	۵
فضیلت سال دوم	تفسیر- منتخبات از کتب: بیضاوی، رازی، محمد عبدہ	۵
	اضواء البیان، علوم القرآن- فتح المنان	۴
فضیلت سال سوم	تاریخ التفسیر- التفسیر والمفسرون (منتخبات)	۵

نصاب کا انفرادی تجزیہ و تبصرہ

(۱) دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کے نصاب کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ابتدائی دو سالوں میں تدریس قرآن کے دو پہلوؤں یعنی تحفیظ و تجوید پر خصوصی توجہ دی ہے، بقیہ تعلیمی سالوں میں تحفیظ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے حالانکہ کم از کم عربی ششم تک متفرق مقامات کی تحفیظ کا اہتمام کیا جانا چاہئے کیوں کہ روزمرہ کی عمومی زندگی میں رہنمائی حاصل کرنے اور مختلف مواقع پر استنباط و استدلال کے لئے

قرآن مجید کے معتدبہ حصہ کا حفظ ضروری ہے۔ تبیین قرآن کے پہلو سے اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو جدید حالات کے تناظر میں اس میں کچھ کمیاں محسوس ہوتی ہیں۔ قرآنی احکام و تعلیمات اور معاصر ضروریات اور تطبیق کا اطمینان بخش جواب فراہم کرنے کے لئے نیز فہم قرآن میں گیرائی و گہرائی حاصل کرنے کے لئے طریقہ تدریس اور نصاب میں شامل مضامین و مواد بظاہر ناکافی ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ عربی سوم تا عربی پنجم میں نحوی و صرفی مشکلات کے حل کے ساتھ ترجمہ قرآن پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ عربی ششم میں تفسیر کے نام پر صرف جلالین پڑھائی جاتی ہے جس کے تفسیری الفاظ قرآنی الفاظ سے تقریباً برابر ہیں۔ اصول تفسیر میں صرف الفوز الکبیر داخل نصاب ہے، علوم القرآن میں کوئی کتاب داخل نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس موجودہ نصاب، مواد مضامین اور طریقہ تدریس کے ذریعہ ہلکی پھلکی تشریح کے ساتھ ترجمہ کرنے کی صلاحیت تو پیدا ہو سکتی ہے، براہ راست غور و فکر، تدبر و تفکر اور فہم قرآن کی ہمہ جہتی صلاحیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اصول تفسیر اور علوم القرآن کی طرف بھرپور توجہ کے بغیر تبیین قرآن کے میدان میں خاطر خواہ پیش رفت ممکن نہیں۔

مختصر یہ کہ دارالعلوم نے تدریس قرآن کے صرف ایک پہلو تجوید پر کسی حد تک توجہ دی ہے تحفیظ و تبیین پر خاطر خواہ اور اطمینان بخش توجہ نہیں دی ہے۔

(۲) ندوۃ العلماء

ندوہ کے نصابی چارٹ پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نے درجات ثانویہ میں تجوید پر خاطر خواہ توجہ دی ہے۔ چنانچہ درجہ ششم، ہفتم، ہشتم میں مشق کے ساتھ تجوید کی کچھ کتابیں بھی شامل نصاب ہیں۔ تدریس کے دوسرے پہلو تحفیظ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے جو ایک بڑی خامی ہے۔ تبیین قرآن کا مقصد پورا کرنے کے لئے درجات عالیہ کے چاروں تعلیمی سالوں میں ترجمہ و تفسیر کا اہتمام کیا گیا ہے اور پورے قرآن کے ترجمہ و تفسیر کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ثالثہ عالیہ میں اصول تفسیر کے طور پر الفوز الکبیر پڑھائی جاتی ہے، رابعہ عالیہ میں مراجع کے طور پر ابن کثیر، کشاف، روح المعانی احکام القرآن للجصاص داخل ہے، درجات فضیلت میں، دو اختصاص تفسیر منتخب کرنے والے طلباء کے لئے تفسیری کتابوں کے ساتھ علوم القرآن میں کچھ کتابیں رکھی گئی ہیں۔

اگر گہرائی کے ساتھ اس نصاب کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ تدریس قرآن کے مقاصد کے حصول میں یہ نصاب بھی کافی نہیں ہے، کیوں کہ تدریس قرآن کے اہم پہلو تحفیظ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ تبیین قرآن کے لحاظ سے بھی یہ نصاب کافی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ کیوں کہ اصول تفسیر میں صرف الفوز الکبیر پڑھائی جاتی ہے اور درجات عالیہ یعنی عالمیت تک علوم القرآن میں

کوئی کتاب نصاب میں نہیں ہے جب کہ طلبہ کی اکثریت عالمیت کی سند پر ہی اکتفاء کرتی ہے۔

(۳) مدرسة الاصلاح سرائے میر

مدرسۃ الاصلاح کے نصابی چارٹ پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں تدریس قرآن کے دو پہلو تجوید و تحفیظ کی طرف بالکل ہی توجہ نہیں دی گئی ہے جبکہ تدریس قرآن کا پہلا زینہ تجوید اور دوسرا زینہ تحفیظ ہے اسے ایک بڑی خامی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے شاید اسی خامی کے پیش نظر مولانا صدرالدین اصلاحیؒ نے ڈاکٹر تابش مہدی سے ایک ملاقات میں تجوید سے متعلق گفتگو کے ضمن میں مزاحاً فرمایا تھا "تابش صاحب! ہم لوگ ایک ایسے ادارہ کے پڑھے ہوئے ہیں جہاں قرآن عربی میں نہیں اردو میں پڑھا جاتا ہے"[9]

تبیین قرآن پر بھرپور توجہ دی گئی ہے، براہ راست قرآن سے طلبہ کا رشتہ جوڑنے اور ان کے اندر تدبر و تفکر کی صلاحیت پیدا کرنے کی عمدہ کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ یہاں کسی تفسیری کتاب کا سہارا لئے بغیر قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ البتہ اس ناحیہ سے ایک بڑی کمی یہ پائی جاتی ہے کہ نصاب میں اصول تفسیر کی کوئی کتاب داخل نہیں ہے، علوم القرآن کے نام پر عربی ہفتم اور ہشتم میں صرف مفردات القرآن للفراہی اور اسالیب القرآن للفراہی داخل ہے جو یقیناً علوم القرآن پر عبور حاصل کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس طرح اصول تفسیر اور علوم القرآن میں درک حاصل کئے بغیر تبیین قرآن کا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو یقیناً ایک دشوار گزار مرحلہ ہے۔

(۴) جامعة الفلاح بلریا گنج

جامعۃ الفلاح کے نصابی چارٹ پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ اس نے تدریس قرآن کے دو پہلوؤں تحفیظ و تبیین پر خاطر خواہ توجہ دی ہے البتہ تجوید و ترتیل کے پہلو پر توجہ نہیں کے برابر ہے چنانچہ صرف عربی سال اول و دوم میں اصول تجوید میں جمال القرآن کا تذکرہ ہے باقی اور کسی تعلیمی سال میں باضابطہ اس کا ذکر نہیں ہے جبکہ عربی سوم تک کم از کم لازماً اس کا اہتمام کیا جانا چاہئے تاکہ تدریس قرآن کے پہلے زینہ پر قدم جمانے کے بعد اگلے زینوں پر چڑھنا آسان ہوجائے، اس کے ساتھ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں تحفیظ پر پوری توجہ دی گئی ہے، چنانچہ عربی اول سے عربی ہشتم تک متفرق مقامات کی تحفیظ کو لازم قرار دیا گیا ہے اور باضابطہ اس کا امتحان ابتدائی درجات میں شفوی اور نہائی درجات میں تحریری لیا جاتا ہے۔ تبیین قرآن کا مقصد حاصل کرنے کے لئے مدرسۃ الاصلاح کے انداز و اسلوب کو اختیار کیا گیا ہے چنانچہ کسی بھی تعلیمی سال میں تفسیر کی کوئی کتاب باضابطہ داخل نصاب نہیں ہے، براہ راست قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ البتہ جامعہ

کا نصاب الاصلاح کے نصاب سے اس معنی میں قدرے مختلف ہے کہ اصلاح میں تفسیر کی کوئی کتاب باقاعدہ یا مراجع کے طور پر نہیں رکھی گئی ہے خواہ وہ کتاب تفسیر الماثور سے متعلق ہو یا تفسیر بالرائ المحمود سے۔ لیکن جامعہ کے نصاب میں فضیلت سال اول میں خصوصی مطالعہ کے لئے تفسیر ابن کثیر، فضیلت سال دوم میں فتح القدیر اور سال سوم میں تفسیر الکشاف طے کی گئی ہے۔ جو یقیناً لائق ستائش اور قابل تحسین ہے۔ اسی طرح جامعہ کا نصاب اس جہت سے بھی اصلاح سے مختلف ہے کہ جامعہ کے نصاب میں عربی چہارم میں اصول تفسیر میں مقدمہ اصول تفسیر ابن تیمیہ، عربی پنجم میں مقدمہ نظام القرآن للفراہی شامل ہے۔ فضیلت سال اول میں علوم القرآن میں مباحث فی علوم القرآن لمناع قطان اور اصول تفسیر میں الفوز الکبیر۔ سال دوم میں علوم القرآن میں مناہل العرفان فی علوم القرآن اور اصول تفسیر میں دلائل النظام للفراہی۔ سال سوم میں علوم القرآن میں الاتقان فی علوم القرآن اور اصول تفسیر کے طور پر اسالیب القرآن خصوصی مطالعہ کے لئے منتخب کی گئی ہیں گویا اس طرح اصول تفسیر اور علوم القرآن میں کسی حد تک درک پیدا کرنے کی عمدہ کوشش کی گئی ہے جو اگرچہ بہت کافی نہیں تو ناکافی بھی نہیں ہے۔

(۵) جامعہ اشرفیہ مبارکپور

اس کے نصابی چارٹ کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نے تدریس قرآن کے ایک پہلو تجوید پر کماحقہ توجہ دی ہے چنانچہ عربی اول اور عربی سوم و چہارم میں تجوید کی مختلف کتابوں کے ساتھ حفظ سورتوں کی تدوین و ترتیل لازم کی گئی ہے جو ایک مبارک قدم ہے البتہ عربی دوم کا تجوید و ترتیل سے بالکل خالی ہونا سمجھ سے بالاتر ہے۔ تدریس قرآن کے دوسرے پہلو یعنی تحفیظ کے نام پر صرف عربی اول میں پارہ عم کی تحفیظ پر اکتفاء کیا گیا ہے باقی اور درجات میں تحفیظ کا کوئی ذکر نہیں ہے جو یقیناً ایک بڑی ناکامی ہے۔ تیسرے اور سب سے اہم پہلو تبیین قرآن کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس سلسلے میں نصاب اور طریقہ تدریس ناکافی ہے، عربی چہارم میں ترجمہ قرآن کے لئے ہفتہ میں صرف دو گھنٹیاں رکھی گئی ہیں اور پورے سال میں صرف تین پارہ سرسری ترجمہ کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے، عربی ششم میں تفسیر کے نام پر جلالین سورۂ انعام تک اور اصول تفسیر میں زبدۃ الاتقان، عربی ہفتم میں تفسیر کے نام پر مدارک التنزیل سورہ کہف سے سورہ فرقان تک پڑھائی جاتی ہے اصول تفسیر میں کوئی کتاب داخل نہیں ہے فضیلت میں تفسیر کے نام پر بیضاوی شریف داخل ہے اور کنزالایمان کی روشنی میں سورہ اعراف تا ختم سورۂ یونس کے مطالعہ کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ اصول تفسیر کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اس تفصیلی تجزیہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ گویا پورے تعلیمی سالوں میں بھی مکمل قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کی نوبت نہیں آتی۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ مضامین و مواد اور طریقہ تدریس کے ذریعہ فہم قرآن اور

براہ راست تدبر و تفکر اور اخذ و استنباط کی صلاحیت طلبہ کے اندر پیدا نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے اصول تفسیر اور علوم القرآن کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے جو یقیناً فہم قرآن کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

(٦) جامعہ سلفیہ بنارس :

اس کے نصابی چارٹ پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نے تدریس قرآن کے تحفیظ و ترتیل والے پہلوؤں پر ایک حد تک توجہ دی ہے۔ چنانچہ متوسط سال اول میں سورہ فجر تا سورہ ناس۔ سال دوم میں سورہ نبا تا غاشیہ، سال سوم میں سورہ جن تا المرسلات، ثانویہ سال اول میں سورہ ملک تا سورہ نوح، سال دوم میں سورہ سجدہ، الواقعہ، الجمعہ، المنافقون اور سورہ الدھر کی تحفیظ و ترتیل کا باضابطہ نظم ہے اور اس کے لئے بعد نماز مغرب کا وقت مختص کیا گیا ہے یہ یقیناً ایک اچھی کوشش ہے۔ البتہ تبیین قرآن کے لئے جو مواد اور طریق ہائے کار اختیار کئے گئے ہیں وہ طلبہ کے اندر براہ راست قرآن سے استفادہ کرنے کی لیاقت پیدا کرنے میں ناکافی ہیں۔ متوسط سال سوم سے فضیلت سال اول تک اگرچہ پورے قرآن کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن متوسط سال سوم سے ثانویہ سال دوم تک سورہ فرقان تا سورہ ناس رواں ترجمہ کرایا جاتا ہے اور عالمیت سال اول سے فضیلت سال اول تک مختلف تفسیری کتابوں کے حوالے سے تدریس ہوتی ہے۔ مثلاً عالمیت سال اول تفسیر جلالین سورہ فاتحہ تا الاعراف۔ سال دوم تیسیر العلی القدیر سورہ انفال تا طہ، فضیلت سال اول میں فتح القدیر سورہ انبیاء تا الشعراء داخل نصاب ہے۔ فضیلت سال دوم میں مختلف تفسیری کتابوں بیضاوی، رازی، محمد عبدہ اور اضواء البیان کے منتخبات داخل ہیں۔

تشریح قرآن کے بنیادی ذرائع اصول تفسیر اور علوم القرآن کے حوالے سے اگر اس نصاب پر نظر ڈالی جائے تو بے حد کمی محسوس ہوتی ہے کیوں کہ اصول تفسیر میں صرف ایک کتاب الفوز الکبیر ہے۔ عالمیت سال دوم میں اور علوم القرآن کے نام پر صرف ایک کتاب فتح المنان فضیلت سال دوم میں داخل ہے۔ فضیلت سال سوم میں تاریخ تفسیر کے موضوع پر التفسیر والمفسرون کے منتخبات رکھے گئے ہیں۔

مختصراً یہ کہ اس جامعہ نے تحفیظ و ترتیل پر کماحقہ توجہ دی ہے لیکن تدریس قرآن کے سب سے اہم پہلو تبیین قرآن کے لئے متوازن اور معتدل نصاب ترتیب نہیں دیا ہے، اور نہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ پورے قرآن کا ترجمہ ضروری تشریحات اور نحوی و صرفی مشکلات کے حل کے ساتھ پڑھا دیا جاتا۔ اس کے بعد تفسیری کتابوں کے ذریعہ مزید درک پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تاکہ طلبہ کے اندر براہ راست تفکر و تدبر کی صلاحیت پیدا ہو جاتی اور اس کے بعد تفسیری کتابوں کے ذریعہ مزید اس کو جلا بخشی جاتی۔

(جاری)

مراجع و مصادر

١۔ بحوالہ بحوث اسلامی اور مدارس دینیہ، مجموعہ مقالات سیمینار منعقدہ ۲۵-۲۷ فروری ۲۰۰۵ء بمقام جامعۃ الفلاح ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج، سن طبع عشر ۲۰۰۶ء بار اول

٢۔ بحوالہ سابق

٣۔ سورۃ النحل: آیت:۴۴

٤۔ سورۃ الجمعہ: آیت:۲

٥۔ سورۃ المزمل: آیت:۴

٦۔ سورۃ الحجر: آیت:۹

٧۔ ششماہی علوم القرآن: خصوصی اشاعت مقالات سیمینار۔ مقالہ: اشہد رفیق ندوی ص: ۲۸۷

٨۔ بحوالہ محاضرات قرآنی۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی ص: ۳۲-۳۴ ادیب پبلشرز، دریا گنج نئی دہلی سنہ اشاعت ۲۰۰۵ء

٩۔ ماہنامہ زندگی نو۔ ماہ جون ۲۰۱۰ء

☆☆☆

وبالوالدین احسانا کا مفہوم

ڈاکٹر محی الدین غازی *

والدین کے حقوق میں ادنیٰ کوتاہی نہ ہو، اولاد کو اپنے مصالح کے حصول کی پوری آزادی ہو، اور خاندان کا نظام شورائیت کی بنیاد پر قائم ہو، بس یہی پیش نظر تحریر کا مقصود ہے۔

والدین کے تئیں سعادت مندی، ان کے ساتھ حسن سلوک، ان کی خدمت، ان کو خوش رکھنے کی ہر آن کوشش، ان کی راحت کے لئے ہر ممکن انتظام، ان کی دنیا و آخرت کی شادمانی و کامرانی کے لئے فکر مندی، ان کے سامنے خاکساری اور ان کے لئے رحمت و محبت کے جذبات، یہ سب اس احسان میں شامل ہیں جو والدین کے سلسلے میں مطلوب ہے اور جس کی تاکید قرآن مجید اور احادیث رسول میں اتنی زیادہ ہے کہ کسی اور شریعت میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔

والدین کے ساتھ حسن تعلق فطرت کا تقاضا بھی ہے، کیوں کہ انسان فطرتاً احسان مند واقع ہوا ہے، منعم کی شکر گزاری آسمانی شریعت سے پہلے خود اس کی فطرت اور عقل عام اس پر واجب کرتی ہے، منعم کی شکر گزاری کے مستحق ہونے پر کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں والدین کے تئیں احسان کا حکم دیا وہاں ان کے احسانات کو یاد دلایا، بطور خاص والدہ کے احسان کو، کہ اس میں انسان کے لئے غیر معمولی اپیل ہے۔ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ احسان کے اعتراف کی بہت خوبصورت تعبیر ہے۔

والدین کے ساتھ حسن تعلق اس اجتماعی نظام کی برقراری کے لئے بھی ضروری ہے جس پر نسل انسانی کی اپنی خصوصیات اور امتیازات کے ساتھ بقا کا انحصار ہے۔

والدین کے تئیں احسان کا قرآنی تصور مادی دنیا کے اس رویہ کی نفی کرتا ہے، جس میں والدین کی مادی افادیت ختم ہو جانے کے بعد انہیں کسی اولڈ ایج ہاؤس کی نذر کر دیا جاتا ہے، استعمال کرو اور پھینک دو مادی دنیا کا آئین ہے۔ اسلام احسان شناسی کی تعلیم دیتا ہے، کہ احسان کبھی بھی کیا گیا ہو، اس کی قدر ہمیشہ کی جانی چاہئے۔

اولاد کے والدین کے ساتھ مطلوب تعلق کی تعبیر قرآن مجید میں دو الفاظ سے کی گئی ہے، بِر اور احسان۔

---

*دار الشریعہ متحدہ عرب امارات

احسان کی تعبیر وہاں اختیار کی گئی ہے جہاں اس سلسلے میں ہدایت دی گئی ہے، جبکہ بِر کی تعبیر بعض انبیاء کی توصیف کرتے ہوئے اختیار کی گئی۔ یہ دونوں الفاظ بے حد جامع اور پر از معانی ہیں، محض اطاعت، محض احسان شناسی، محض خاکساری، محض ضروریات کی تکمیل سے معنی کی وہ ادائیگی نہیں ہوتی ہے جو ان دو میں سے ہر لفظ اپنے آپ میں سموئے ہوئے ہے۔

احادیث میں والدین کے ساتھ حسن تعلق کی اہمیت وفضیلت کے سیاق میں برالوالدین کی تعبیر اور اس کی ضد کے لئے عقوق کے الفاظ اختیار کئے گئے ہیں۔

تاہم احسان کی بار بار تاکید کے باوجود قرآن میں والدین کی اطاعت کا حکم کہیں نہیں دیا گیا، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ احسان کا تصور والدین کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے، لیکن اطاعت کا تصور اولاد کی حق تلفی کا سبب بن سکتا ہے۔ اطاعت صرف اس کی ہونی چاہئے جس کے حکم کا برحق اور مفید ہونا یقینی ہو، یعنی اللہ اور اس کا رسول، اجتماعی معاملات میں اولوالامر کی اطاعت کی وجہ یہ ظن غالب ہے کہ شرعی اور عادلانہ طریقہ سے اولوالامر کے منصب پر فائز افراد کو اجتماعی مصالح کا علم عام افراد سے زیادہ ہوتا ہے، کیوں کہ وہ اس منصب تک اپنے امتیازی اوصاف کی وجہ سے ہی پہونچائے جاتے ہیں، نیز یہ کہ نظم اجتماعی کے لئے ان کی یک گونہ اطاعت ضروری ہے، تاہم جس طرح رعایا ولی امر کی اطاعت کی مکلف ہے، اسی طرح ولی امر پر رعایا سے مشورہ بھی لازم ہے، اسلام اولاد کو غلاموں کا مقام نہیں دیتا اس نے تو غلاموں کو اولاد کا درجہ دیا، علامہ حمید الدین فراہی اپنے تفسیری حواشی میں لکھتے ہیں، تمدن کے آغاز میں بیٹے کی حیثیت غلام کی ہوتی تھی، باپ کے لئے اپنی اولاد کو قتل کرنا جائز تھا، پھر اسلام نے غلاموں کا درجہ بلند کر کے اولاد کے برابر کر دیا۔ (۱) بایں ہمہ انسان والدین کی اس اطاعت کا مکلف بنایا ہے جس سے احسان کے تقاضے پورے ہوتے ہوں۔

اگر والدین اپنی خدمت کا حکم دیتے ہیں تو ان کی بات ماننا ضروری ہے کیوں کہ یہ احسان کا حصہ ہے۔

والدین کی مادی ضروریات کی تکمیل بھی احسان کے تحت آتی ہے، اگر والدین کسی ایسی ضرورت کی تکمیل کا حکم دیتے ہیں تو ان کا وہ حکم بجا لانا احسان میں شامل ہوگا۔

علامہ ابن تیمیہ نے ایک مختصر جملے سے احسان اور اطاعت کے فرق کو واضح کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ماں بیٹے کو اپنی بیوی کو طلاق دینے کا حکم دے تو اسے نہیں ماننا چاہئے، بل علیه أن یبرها ولیس تطلیق امراته من برها وہ ماں کے ساتھ حسن سلوک کا مکلف ہے اور بیوی کو طلاق دینا ماں کے ساتھ حسن سلوک کے ذیل میں نہیں آتا۔

گویا احسان کے تحت اطاعت اس صورت میں داخل ہوتی ہے جب کہ والدین کو اس کا نفع پہنچ رہا ہو یا والدین سے ضرر دفع ہو رہا ہو۔ شیخ محمد بن ابراہیم آل شیخ بطور اصول بتاتے ہیں کہ والدین اگر ایسی بات کا حکم دیں جس میں خود ان کا مفاد ہو تو ان کی اطاعت ضروری ہے، لیکن اگر ایسا حکم دیتے ہیں جس میں ان کا مفاد نہ ہو یا الٹا ان کا نقصان ہو تو اطاعت واجب نہیں ہے۔ (۲) قابل ذکر بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں نہ تو والدین کے سلسلے میں اطاعت کا لفظ کہیں استعمال کیا گیا، اور نہ ہی کسی عمل کو ان کی اجازت یا رضامندی پر موقوف کیا گیا ہے، وہ احادیث جو امت کے لئے عمومی خطاب رکھتی ہیں ان کا انداز بھی والدین کے حقوق کے بیان میں قرآن مجید سے مماثل ہے۔

بعض انفرادی واقعات میں متعین افراد کو اللہ کے رسول ﷺ نے والدین کی اجازت لینے کو یا کسی خاص معاملہ میں ان کی بات مان لینے کو کہا، محدثین اور فقہاء نے اس کو عمومی خطاب کا درجہ دے دیا، اور واعظین نے اس میں مبالغہ آمیزی کر دی۔

امام ماوردی کی چوک

امام ماوردی لکھتے ہیں، اگر کسی مجاہد کے مسلم ماں باپ حیات ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر اس کے لئے جہاد کرنا درست نہیں ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، وقضی ربک الا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا، اس آیت میں اللہ نے اپنی اطاعت اور والدین کی اطاعت کو ایک ساتھ جمع کر دیا ہے فجمع بین طاعته و طاعة الوالدين۔ (۳)

امام ماوردی کا یہ بیان قرآنی الفاظ سے مطابقت نہیں رکھتا، قرآن مجید نے اس مقام پر اور دیگر مقامات پر بھی احسان کا لفظ اختیار کیا ہے، اور احسان بہرحال اطاعت کا ہم معنی لفظ نہیں ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس مقام پر لکھتے ہیں، احسانا یہاں فعل محذوف سے مفعول مطلق ہے، اس وجہ سے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان کے ساتھ نہایت بہتر سلوک کیا جائے، یہاں سیاق کلام سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ اگر عبادت میں کسی اور کو شریک کرنے کی کوئی ادنیٰ گنجائش بھی ہوتی تو اس کے حق دار والدین ہو سکتے تھے لیکن جب خدا نے ان کو بھی شریک نہیں کیا، ان کو صرف احسان ہی کا حقدار ٹھہرایا تو بدیگراں چہ رسد۔ (۴)

مولانا امین احسن اصلاحی کا ایک ترجمہ

لیکن آگے چل کر واخفض لهما جناح الذل من الرحمة کا ترجمہ مولانا نے یوں کیا، اور ان کے لئے رحمدلانہ اطاعت کے بازو جھکائے رکھو۔ مولانا امانت اللہ اصلاحی نے اس ترجمہ کی اصلاح کرتے ہوئے یوں املاء کرایا اور ان کے لئے رحمت کے جذبے سے خاکسارانہ بازو جھکائے رکھو۔

ذل کے معنی مولانا امین احسن اصلاحی نے اطاعت و فرمانبرداری کے بتائے، اس پر مولانا امانت اللہ اصلاحی نے بتایا کہ ذل کے معنی خاکساری کے ہیں، اس لفظ کے حسن انتخاب پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا نے بتایا کہ اطاعت اس وقت کی جاتی ہے جب کوئی فرمان جاری ہو، جبکہ ذل بمعنی خاکساری ایک مستقل رویہ ہوتا ہے۔ والدین کی طرف سے کوئی مطالبہ ہو یا نہ ہو اولاد کا رویہ ان کے تئیں ہمیشہ خاکسارانہ ہونا چاہئے۔

خاندان کا مفاد یا والدین کی اطاعت

اسلام کا عائلی نظام اس وقت ایک پیچیدہ صورتحال سے دوچار ہوتا ہے، جب خاندان کے مفاد اور بسا اوقات اس کی بقا اور والدین کی اطاعت میں سے کسی ایک کا انتخاب ضروری ہو جاتا ہے۔

صحیح ابن حبان کی روایت ہے جسے ناصر الدین البانی نے صحیح قرار دیا ہے: ایک شخص صحابی رسول ابودرداء کے پاس آیا اور کہا: میرے والد نے میرے پیچھے پڑ کر میری شادی کرائی، اور اب وہ اسے طلاق دینے کا حکم دے رہے ہیں، ابودرداء نے جواب دیا: میں نہ تو تم سے یہ کہوں گا کہ اپنے باپ کی نافرمانی کرو، اور نہ یہ کہ اپنی بیوی کو طلاق دو، البتہ اگر چاہو تو میں تمہیں وہ بات سنادوں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے، میں نے آپ ﷺ کو فرماتے سنا، ماں باپ جنت کا عالیشان دروازہ ہیں۔ تم اس دروازے کی حفاظت کرتے ہو، یا اس سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہو یہ تم پر ہے۔ (۵) راوی کا خیال ہے کہ اس آدمی نے بالآخر اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔

اس سے ملتا جلتا واقعہ خود رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں پیش آیا، صحابی رسول عبداللہ بن عمر کا بیان ہے، میرے پاس ایک بیوی تھی، میں اس سے محبت کرتا تھا، (میرے باپ) عمر اس کو ناپسند کرتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا، اسے طلاق دے دو، میں نے بات ماننے سے انکار کر دیا، عمر رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے اور آپ کے سامنے معاملہ پیش کیا، آپ ﷺ نے مجھ سے کہا، اسے طلاق دے دو۔ (۶)

امام شوکانی کا سخت موقف

ابن عمر کا واقعہ بیان کرنے کے بعد امام شوکانی لکھتے ہیں: یہ صریح دلیل ہے اس بات کی کہ جب باپ بیٹے کو اپنی بیوی کو طلاق دینے کا حکم دے تو اس پر واجب ہے کہ وہ اسے طلاق دے، اس کی اپنی بیوی سے محبت بیوی کو روک رکھنے کے لئے عذر نہیں بنے گی، اس حکم میں ماں بھی باپ کے ساتھ شامل ہے۔ (۷)

ذرا نرم موقف

فیض القدیر کے مصنف لکھتے ہیں: اگر وہ اس کی بیوی کو طلاق دینے کا حکم دے، تو ایک گروہ کا کہنا

ہے کہ اسے ماننا چاہئے، (دلیل میں ابن عمر کا واقعہ بیان کرتے ہیں) ابن العربی نے اس (ابن عمر کے واقعہ) کی شرح میں لکھا ہے: یہ صحیح ہے اور ثابت ہے اور اپنے بیٹے کی بیوی کو طلاق دینے کا حکم سب سے پہلے ابراہیم خلیل علیہ السلام نے دیا تھا، نمونہ کے لئے یہ کافی ہے، باپ کے تئیں بیٹے کی سعادت مندی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جسے ناپسند کرے بیٹا بھی اسے ناپسند کرے خواہ اسے بیوی سے محبت ہی کیوں نہ ہو، البتہ یہ اس وقت ہے جبکہ باپ دیندار اور نیک ہو، اس کی محبت اور نفرت اللہ کے لئے ہوتی ہو، اور نفس پرست نہ ہو، اگر وہ ان صفات کا حامل نہ ہو تو بھی اس کے لئے مستحب یہی ہے کہ اس کی خوشی کی خاطر اپنی بیوی کو چھوڑ دے، ہاں یہ اس طرح واجب نہیں ہے جس طرح پہلی صورت میں ہے۔ (۸)

ایک سلفی عالم شیخ مشہور بن حسن آل سلمان سے جب اس بارے میں استفتاء کیا گیا تو ان کا جواب تھا، اگر بیٹے کی معلومات کے مطابق باپ انصاف پسند اور دیانتدار ہے اور اسے طلاق دینے کا حکم دیا ہے تو اس پر حکم کا ماننا واجب ہوگا، مزید برآں باپ کے لئے ضروری نہیں ہوگا کہ وہ بیٹے کو اپنے حکم کی وجہ بتائے، ہوسکتا ہے باپ کی نظر میں کوئی ایسی وجہ ہو جس کی بنا پر وہ سمجھتا ہو کہ شرعاً اسے بیٹے کو طلاق کا حکم دینا چاہئے، اور اس وجہ کو بیٹے سے مخفی رکھنا بھی قرین مصلحت ہو، لہٰذا اپنے باپ کے انصاف و دیانت پر اعتماد کرتے ہوئے اسے اطاعت کرنا چاہئے اور اپنی بیوی کو طلاق دے دینا چاہئے۔ (۹)

امام احمد کا موقف

مذکورہ بالا موقف کے برعکس امام احمد بن حنبل کا موقف تھا، ان سے ایک شخص نے آکر پوچھا، میرے باپ کا حکم ہے کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں، انھوں نے کہا تم اسے طلاق مت دو، اس شخص نے کہا، عمر نے بھی تو اپنے بیٹے عبداللہ کو بیوی کو طلاق دینے کا حکم دیا تھا، انھوں نے جواب دیا، تمہارا باپ جب عمر جیسا ہو جائے تب ایسا ہوسکتا ہے۔ ”حتی یکون أبوک مثل عمر“۔ (۱۰)

امام ابن تیمیہ کا موقف

ابن مفلح نے امام ابن تیمیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے: والدین میں سے کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ بیٹے کو پابند کرے ایسی لڑکی سے نکاح پر جو اسے پسند نہ ہو، اور اگر وہ انکار کرتا ہے تو نافرمان نہیں ہوگا، جب کسی کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ کسی کو ایسی چیز کھانے کا پابند کرے جس سے اسے نفرت ہو، حالانکہ وہ پسندیدہ چیز کھا سکتا ہو، تو نکاح کا معاملہ تو اسی طرح کا یا اس سے بھی زیادہ قابل لحاظ ہے، کیوں کہ ناپسندیدہ چیز کو کھانے کی تلخی گھڑی بھر کی ہوتی ہے، اور ناپسندیدہ جوڑے کے ساتھ زمانے بھر کا ساتھ ہوتا ہے، جس میں انسان خواہ وہ شوہر ہو یا بیوی، تکلیف میں رہتا ہے، مگر تکلیف سے چھٹکارہ نہیں پا سکتا۔ (۱۱)

علامہ ابن تیمیہ سے سوال کیا گیا: ایک شخص شادی شدہ ہے، صاحب اولاد ہے، اس کی ماں اس کی بیوی کو ناپسند کرتی ہے اور اسے طلاق دینے کو کہتی ہے، کیا اسے طلاق دینا جائز ہے۔

انھوں نے جواب دیا، ماں کے کہنے کی وجہ سے اسے طلاق دینا اس کے لئے جائز نہیں ہے، اس پر ماں کے ساتھ حسن سلوک (بر) واجب ہے اور اپنی بیوی کو طلاق دینا بر میں نہیں آتا۔ (۱۲)

ایک اور سوال کیا گیا، شوہر اور بیوی باہم رضامند ہیں، بیوی کی ماں دونوں میں جدائی چاہتی ہے، بیٹی اس کی بات نہیں مانتی، اگر ماں بددعا دیتی ہے تو کیا بیٹی گناہ گار ہوگی؟

جواب دیا، اگر اس کی شادی ہوگئی تو اس کے اوپر شوہر سے جدائی کی بابت اور اس کے گھر والوں کے یہاں جانے سے متعلق نہ تو باپ کی اطاعت واجب ہے اور نہ ہی ماں کی اطاعت واجب ہے، بلکہ والدین سے زیادہ اطاعت کا سزاوار شوہر ہے اگر شوہر اللہ کی نافرمانی کا حکم نہ دے، کوئی عورت اگر اس حال میں وفات پاتی ہے کہ اس کا شوہر اس سے خوش ہے، وہ جنت میں جائے گی اور اگر ماں اس کے شوہر کے درمیان تفریق پیدا کرنا چاہتی ہے تو ماں اس کا تعلق ہاروت ماروت کی قبیل سے ہے اس بارے میں اس کی بات نہیں مانی جائے گی، خواہ وہ بددعا دے دے۔ ماسوا اس کے کہ وہ دونوں مل کر اللہ کی نافرمانی کر رہے ہوں، یا شوہر اس کی بیٹی کو اللہ کی معصیت کا حکم دے، اور ماں اسے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دے جو ہر مسلمان پر واجب ہے۔ (۱۳)

شیخ عثیمین کا موقف

شیخ محمد بن صالح عثیمین نے ایک سوال کے جواب میں فتویٰ یوں دیا: یہ جائز نہیں ہے کہ باپ اپنے بیٹے کو مجبور کرے ایسی عورت سے شادی کرنے پر جسے وہ کسی دینی یا اخلاقی یا جسمانی عیب کی وجہ سے پسند نہ کرتا ہو، بہت سارے لوگ اپنی اولاد کی مرضی کے علی الرغم ان کی شادیاں کرکے شرمندہ ہوتے ہیں، محض یہ کہہ کر کہ یہ میری بھتیجی ہے یا تمہارے خاندان کی ہے یا ایسی ہی کوئی اور وجہ۔ ایسی صورت میں نہ بیٹے کے لئے ضروری ہے کہ وہ قبول کرے اور نہ باپ کے لئے جائز ہے کہ وہ جبر کرے۔

اسی طرح اگر بیٹا نیک عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن باپ منع کرتا ہے، تو بیٹے پر اس کی اطاعت لازم نہیں ہے، کیوں کہ بیٹے پر ایسی چیز کو اختیار کرنے کے سلسلے میں باپ کی اطاعت لازم نہیں ہے، جس کے اختیار کرنے میں باپ کو کوئی نقصان نہیں پہونچ رہا ہو، اور بیٹے کا اس میں فائدہ ہو۔

اگر ہم یہ کہیں کہ بیٹے پر لازم ہے کہ وہ اپنے باپ کی ہر چیز میں اطاعت کرے، ان مواقع پر بھی جہاں بیٹے کا فائدہ ہو اور باپ کا کوئی نقصان نہ ہو تو بہت سارے مفاسد پیدا ہو جائیں گے۔

تاہم ایسی صورتحال میں بیٹے کو چاہئے کہ وہ باپ کے ساتھ دانائی کا معاملہ کرے، جتنا ہوسکے

باپ کو قائل کرے اور اس کی دلداری کرے۔ (۱۴)

ابن عمر کا واقعہ جس کا نہ پس منظر محفوظ ہے نہ تفصیلات محفوظ ہیں کہ طلاق پر حضرت عمر کا اصرار کیوں تھا، ان کے وہ کیا دلائل تھے جنہیں اللہ کے رسول ﷺ نے قبول کیا، مزید برآں روایت کے الفاظ بھی مختلف ہیں، کسی میں ہے کہ آپ ﷺ نے کہا: طلاق دے دو، کسی میں ہے کہ آپ نے کہا اپنے باپ کی بات مانو، اسی لئے علماء میں اس پر دو رائیں ہیں کہ ابن عمر نے طلاق دے کر باپ کا حکم مانا یا آپ ﷺ کا حکم مانا۔

جب روایت کے اندر اس قدر اجمال اور اس کے پس منظر کے سلسلے میں مکمل خاموشی ہو تو عمومی حکم اس کے اندر تلاش کرنے کے بجائے قرآن و حدیث کی عام نصوص اور شریعت کے عمومی مقاصد میں تلاش کرنا مناسب ہے

نکاح ایک پختہ عقد ہے، دوام اور استحکام اس کی روح میں شامل ہے، ناگزیر وجوہات کے بغیر اس عقد کو ختم کرنا مقاصد نکاح کے خلاف ہے، وہ شوہر اور بیوی کا انتہائی حد تک ذاتی معاملہ ہے، عقد ہو جانے کے بعد فریقین کے ماسوا کسی کو بھی اس عقد کو ختم کرنے کا کسی بھی نوعیت کا اختیار دینا، جبکہ دونوں فریق اس عقد کے استمرار پر راضی ہوں، عقد نکاح اور اس سے جڑے ہوئے مقاصد شریعت کے خلاف ہے۔

علامہ ابن تیمیہ نے اس سیاق میں ہاروت اور ماروت کا ذکر کرکے اس آیت کا حوالہ دیا ہے جس میں ضرر رسانی کی ایک بدترین مثال کے طور پر تفریق بین المرء وزوجہ کا ذکر کیا گیا ہے، اس ضرر رسانی کی اجازت نہ ہاروت اور ماروت کے شاگردوں کو تھی اور نہ کسی نادان والدین کو دی جا سکتی ہے۔

اگر والدین کو اس طرح کے جبر کا اختیار دیا گیا تو پھر، سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۳۲ کی کیا معنویت رہ جاتی ہے، وہ آیت صاف صاف کہہ رہی ہے کہ نکاح میں اعتبار شوہر اور بیوی کی باہم رضامندی کا ہے، اولیاء کو جبر کی اجازت نہیں ہے، یعنی نہ عورت کے باپ کو اور نہ مرد کے باپ کو، جب عقد کے قیام کے سلسلے میں آیت کہہ رہی ہے کہ ان کی باہم رضامندی کی اصل اہمیت ہے تو عقد کی بقاء کے سلسلے میں تو بدرجہ اولی اس کی اہمیت ہوگی۔

یہاں یہ کہنا بھی درست نہیں ہوگا کہ نکاح و طلاق کے سلسلے میں قانونی اختیار تو شوہر کو ہے البتہ دیانۃً اسے والدین کی بات ماننا چاہئے، کیوں کہ مومن کی نظر میں تو دراصل اسی کی اہمیت ہوتی ہے کہ اللہ کی رضا کیا ہے اور کار ثواب کیا ہے، اگر والدین کے حکم پر اپنی بیوی کو طلاق دینا ہی کار ثواب اور رضائے الٰہی ہے تو پھر اس کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی کہ قانوناً اور قضاءً اسے کیا اختیارات حاصل ہیں۔

شورائیت پر مبنی خاندان

وامرھم شوری بینھم ایک ٹھوس قرآنی اصول ہے، اسے نظام حکومت کے لئے خاص کرنا درست نہیں ہے، یہ اصول بتاتا ہے کہ فیصلوں کا دارومدار نہ جذبات پر ہونا چاہئے، اور نہ کسی فرد کے احترام پر، بلکہ اس کا دارومدار جلب مصالح اور درء مفاسد کے اصول پر ہونا چاہئے، مصالح اور مفاسد کا تعین کرنے اور کسی امر خاص میں نفع اور ضرر کا تناسب طے کرنے کا بہترین ذریعہ شورائی عمل ہے، والدین میں سے کسی کی رائے اگر سودمند ہو تو اسے قبول کرنا واجب ہے، والدین اگر اولاد کو ایسے کسی عمل سے باز رہنے کو کہیں جس میں ضرر کا پہلو غالب ہو تو انہیں ان کی بات ضرور ماننا چاہئے تاہم اگر والدین کی رائے اولاد کی نظر میں ضرر رساں ہو، اولاد کی رائے جس سے والدین کو اختلاف ہے اولاد کی نظر میں نفع کے پہلو سے بہتر ہو تو اولاد کو حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ اپنے موقف کو والدین کے سامنے رکھیں اور اگر اولاد کا موقف درست ہے تو والدین کو چاہئے کہ وہ اپنی رائے پر اصرار نہ کریں، غرض فیصلوں پر سود و زیاں کا شعور غالب رہنا چاہئے۔

انسانی زندگی میں والدین کا رول اولاد کی راحت کے لئے ان کی قربانی، پرورش کے ذیل میں انتھک کوششیں، اور اولاد کی خاطر ان کا ہر مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا ہے، اس کا صلہ وہ تمام اعمال ہیں جو ان کی محبتوں اور شفقتوں سے مماثل ہیں، اس کی بہترین تعبیر اس حدیث میں ملتی ہے جس کے راوی حضرت ابوہریرہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک بیٹا اپنے ماں باپ کا صلہ کسی صورت نہیں دے سکتا سوائے اس کے کہ وہ غلامی کی حالت میں اسے ملیں اور وہ انہیں خرید کر آزاد کردے۔ لا یجزی ولد عن والدہ الا ان یجدہ مملوکا فیشتریہ فیعتقہ (۱۵) بالفاظ دیگر وہ اپنے باپ کو نئی زندگی دے، جس طرح اس کے ماں باپ نے اس کے جسد ناتواں کو پال پوس کر زندگی سے لطف اٹھانے کے قابل بنایا۔ آزادی زندگی کے مثل ہے، اسی لئے قتل خطا کا کفارہ مومن غلام کی آزادی کو قرار دیا گیا۔

البتہ فیصلہ سازی میں اہمیت دانائی اور دینی شعور کی ہوتی ہے، علم اور وسعت نظر کی ہوتی ہے، تجربات اور اصابت رائے کی ہوتی ہے، یہ صفات کسی کو محض اس وجہ سے نہیں ملتی ہیں کہ وہ باپ ہے یا اولاد، اس لئے فیصلہ سازی میں متوافق مطلوبہ صفات کا لحاظ ہونا چاہئے نہ کہ صفت پدری اور صفت بزرگی کا۔ ہو سکتا ہے کہ دانائی اور دینی شعور میں باپ بیٹے سے کمتر ہو اور اس کی تجویز یا حکم میں عقلی یا شرعی کسی پہلو سے کوئی کمی ہو، ایسی صورت میں اس کے حکم سے سرتابی مقاصد شریعت کے خلاف نہیں قرار دی جا سکتی۔

علاوہ ازیں، جمہوری اور شورائی مزاج کی تربیت کے لئے اولین تربیت گاہ گھر اور خاندان ہے، گھر

میں بڑوں کی توقیر اور والدین کی خدمت واحترام کے ساتھ ایسے فیصلوں میں جن کا اثر پورے گھر پر ہونے والا ہو، ڈکٹیٹر شپ کے بجائے شورائیت کا طریقہ اختیار کیا جانا چاہئے۔ جن گھروں میں اطاعت کی لاٹھی سے سب کو سرنگوں رکھا جاتا ہے، وہاں ایک گھٹن کا سا ماحول ہوتا ہے، نافرمانی کے دنیوی اور اخروی نتائج سے خوفزدہ ہوکر خاموش تو سب رہتے ہیں مگر مطمئن کوئی نہیں رہتا۔ خاندان کے شیرازہ کی حفاظت اور اس کے استحکام کی ضمانت آمریت سے نہیں شورائیت سے ملتی ہے۔

علامہ محمد بن سالم بیحانی لکھتے ہیں:

جس طرح اللہ تعالیٰ نے بیٹوں پر باپ کے ساتھ حسن سلوک فرض کیا ہے، اسی طرح اللہ نے باپ پر واجب کیا ہے کہ حسن سلوک کی اس ذمہ داری کو کما حقہ انجام دینے میں وہ اولاد کی مدد کریں، ان سے ایسی اطاعت کا مطالبہ نہ کریں جو ان پر شاق گذرے، اور انھیں آزمائش میں ڈال دے، کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنھیں صرف اپنے حقوق سے مطلب ہوتا ہے، وہ دوسروں کے تئیں اپنی ذمہ داری کی بالکل پرواہ نہیں کرتے، وہ اولاد کے ہر معاملہ میں دخیل ہونا چاہتے ہیں، اور ان کے خیالات پر حاکم بن بیٹھتے ہیں، جو وہ سمجھتے ہیں ان کے نزدیک وہی بھلا ہوتا ہے، خواہ وہ کھلی ہوئی غلطی ہو، اور جو وہ ناپسند کریں وہ ان کے نزدیک شر ہوتا ہے، خواہ ان کا فیصلہ عمومی مصالح کے کتنا ہی خلاف ہو، اور ان کی سعادت مند اولاد کے لئے کیسا ہی نقصان دہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے لوگوں کی اطاعت جبکہ اطاعت نہ کرنے سے ان کا کوئی حق متاثر نہ ہوتا ہو اور اطاعت کرنے سے انھیں کوئی فائدہ نہ پہونچتا ہو، واجب نہیں ہے، اور اولاد اگر اپنے ماں باپ سے ان امور میں اتفاق نہ کرے جو ان کے لئے نقصان دہ نہ ہوں اور اطاعت نہ کرنے سے کوئی اعلیٰ مقصد فوت نہ ہوتا ہے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ (۱۶)

درحقیقت اسٹیٹ کی سطح پر مطلق العنان شخصی حکومت اور آمرانہ استبدادی نظام جس کی مسلم امت صدیوں سے عادی بلکہ محافظ اور شیدائی بنی ہوئی ہے، اس کا عکس بسا اوقات گھر کے اندر بھی نظر آتا ہے، جمہوری اور شورائی قدروں کی حوصلہ افزائی پہلے گھر کی سطح پر ہوگی تبھی امت کی سطح پر ذہن اور مزاج تبدیل ہوگا۔

فرد کی آزادی کی اہمیت

فرد کے ارتقاء کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اندر سوچنے کی آزادی، فکر کی جدت، اور فیصلہ کرنے کی قوت ہو، وہ اپنے مستقبل کے خواب خود دیکھے، منصوبے خود تیار کرے، انھیں پایہ تکمیل تک پہونچانے کی ذمہ داری خود قبول کرے۔ والدین کی رہنمائی اور مشورے اس کے لئے زاد سفر کا کام

ہیں، ان کے واجب الاطاعت احکام اس سے سوچنے اور خواب دیکھنے کی آزادی، فیصلہ کرنے اور فکر کرنے کی قوت سلب نہیں کرلیں۔

علاوہ ازیں جن لوگوں نے گھر کے اندر آمریت کے سائے میں تربیت پائی ہو، اندیشہ ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا میں بھی ان کا مزاج اور رویہ یا تو آمرانہ ہوگا یا پھر ماسورانہ ہوگا جو اول الذکر سے زیادہ غلط نامطلوب اور ضرر رساں ہے۔

کیا جہاد کے لئے والدین کی اجازت ضروری ہے؟

امام بخاری نے اپنی کتاب میں ایک باب باندھا، باب الایجاهد الاباذن ابویه، اس کے تحت حدیث ذکر کی جس کے راوی عبداللہ بن عمرو ہیں ان کا بیان ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کے پاس آیا اور کہا، کیا میں جہاد کروں؟ آپ ﷺ نے پوچھا، کیا تمہارے ماں باپ ہیں؟ اس نے کہا ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: ففیهما فجاهد، ان کی صحبت میں جہاد کرو۔ ابن حجر کی تشریح کے مطابق، ان کی خوب خوب خدمت کرو یہ تمہارے لئے دشمن کے ساتھ جہاد کا قائم مقام ہوگا۔ (۱۷)

امام بخاری نے اس حدیث سے یہ استدلال کیسے کیا اس کی وضاحت امام عینی یوں کرتے ہیں، آپ ﷺ نے اسے صرف ماں باپ کی خدمت کے جہاد کا حکم دیا، اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ جہاد نہیں کرے تا آنکہ وہ اسے جہاد کی اجازت دے دیں، سو اس وقت وہ جہاد کرے، گویا کہ ان کا جہاد ان کی اجازت پر موقوف ہے۔ (۱۸)

امام ابن بطال نے اس حدیث سے متعلق دو باتیں بطور خاص ذکر کی ہیں، ایک یہ کہ اگر والدین مشرک ہوں اور جہاد فرض کفایہ کی قسم کا ہو تو کیا ان کی اجازت ضروری ہوگی؟ امام کہتے ہیں کہ ضروری ہے، امام شافعی کے نزدیک ضروری نہیں ہے۔ دوسرا ابن منذر کے حوالے سے ہے، کہ اجداد باپ کے برابر اور جدات ماں کے برابر ہیں، سو آدمی کو جہاد پر جانے کے لئے ان کی بھی اجازت ضروری ہوگی۔

قرآن مجید میں جہاد کے سلسلے میں بھی احکام ہیں اور والدین کے سلسلے میں بھی، لیکن کہیں اشارۃً بھی جہاد کو یا کسی بھی دینی عمل کو والدین کی اجازت سے مربوط نہیں کیا گیا ہے، اسی طرح احادیث میں بھی کسی عمومی ہدایت کے ذریعہ کسی بھی دینی مطالبہ کو ان کی اجازت پر موقوف نہیں کیا گیا۔

قرآن مجید میں سورہ توبہ کی آیت نمبر ۲۴ تو بہت صاف کہتی ہے کہ والدین کی محبت کا جہاد کی محبت پر غالب آنا گناہ کی بات ہے۔

اس سلسلے میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ وہ تمام واقعات جن میں اللہ کے رسول ﷺ نے جہاد میں شرکت کے بجائے والدین کی خدمت کی تاکید کی، یا والدین کی اجازت کو جہاد میں جانے کے لئے

مشروط قرار دیا، غیر معروف افراد سے متعلق ہیں، ایک آدمی کہہ کر ان کا ذکر ہوا ہے، صرف جاہمہ سلمی کا نام آتا ہے، جو غیر معروف ہیں، ان کی زندگی کے حالات بھی نہیں ملتے، کسی بھی معروف صحابی کے سلسلے میں ایسی ہدایت اللہ کے رسول نے دی ہو اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ (۱۹)

احادیث میں مذکورہ واقعات چونکہ انفرادی نوعیت کے ہیں اس لئے ان کی توجیہ کرنا چاہئے، راقم کے خیال میں ان کی درج ذیل توجیہات ممکن ہیں۔

☆ جہاد کے لئے اجازت مانگنے والا فرد جہاد کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو۔

اس توجیہ کی تائید ایک روایت سے ہوتی ہے، جس کے راوی حضرت انس ہیں وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آیا اور کہا، مجھے جہاد کا بے حد شوق ہے، مگر میرے اندر اس کی طاقت نہیں ہے، آپ ﷺ نے پوچھا، والدین میں سے کوئی باحیات ہے، اس نے بتایا کہ ماں ابھی حیات ہے، آپ ﷺ نے اس سے کہا، اس کی خدمت کرکے اللہ کو راضی کرو، اگر تم ایسا کر لیتے ہو تو تم حاجی بھی ہو معتمر بھی ہو اور مجاہد بھی ہو۔ (۳۰)

☆ اجازت مانگنے والے فرد کے ماں باپ بالکل تنہا ہوں، اور کوئی ان کا پرسان حال نہ ہو۔

اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے، جس کے راوی ابوسعید خدری ہیں، کہ یمن سے ایک شخص اللہ کے رسول ﷺ کے پاس ہجرت کرکے آیا، آپ ﷺ نے پوچھا، یمن میں تمہارا کوئی قریبی ہے، اس نے کہا میرے ماں باپ، آپ ﷺ نے پوچھا، انہوں نے اجازت دی، اس نے کہا نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا، ان کے پاس لوٹ جاؤ، ان سے اجازت لو، اگر وہ اجازت دیدیں تو جہاد کرو، ورنہ ان کی خدمت کرو۔ (۳۱)

فقہاء نے انفرادی واقعات کی بنیاد پر کہا کہ اگر جہاد فرض کفایہ ہو تو والدین کی اجازت کے بنا اس میں شرکت حرام ہے، اور اگر جہاد فرض عین کی صورت اختیار کرلے تو والدین کی اجازت کی شرط ختم ہو جائے گی، جہاد فقہاء کے مطابق فرض عین کی صورت اس وقت اختیار کرتا ہے جب امیر کی جانب سے نفیر عام ہو، یا دشمن حملہ آور ہو جائے۔

تاہم اگر بات روایتوں کی کی جائے تو ایک سند اً صحیح روایت کے مطابق دشمن کے حملہ کی صورت میں بھی مقابلہ پر جانے کے لئے والدین کی اجازت ضروری ہے، وہ روایت طبرانی کی ہے جسے حافظ ہیثمی نے بھی طبرانی کے حوالے سے نقل کیا ہے، اور اس کے تمام راویوں کی توثیق کی ہے، طبرانی کے الفاظ ہیں، ان کان العدو عند باب البيت فلا تذهب الا باذن ابويك، اگر دشمن گھر کے دروازے پر ہو تب بھی اپنے ماں باپ کی اجازت کے بنا مت جاؤ (۳۲) ہیثمی نے نقل کرتے ہوئے

دوسری جگہ غزو لکھ دیا ہے کہ اگر لڑائی گھر کے دروازے پر ہو رہی ہو تو بھی والدین کی اجازت کے بنا مت جاؤ۔ (۳۳)

دراصل عام حالات میں جبکہ والدین کو اولاد کے کسی اقدام سے براہ راست کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا ہو، دین پر عمل کرنے اور اسے غالب کرنے کی تمام تر کوششوں میں مسابقت کی کھلی اجازت ہونا چاہئے۔ بطور مثال اگر کسی شخص کے کئی بھائی جو والدین کے تئیں تمام ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے تیار بھی ہیں، یا والدین کی دیکھ بھال اور ضرورتوں کی تکمیل کے تعلق سے مناسب انتظام کردیا گیا ہے، تو محض والدین کی اولاد سے فطری محبت اس کا راستہ نہ روکے اگر وہ غلبہ دین کے لئے ہونے والی کسی کوشش میں شامل ہونا چاہتا ہو۔

کیا برالوالدین کی جہاد پر افضیلت قطعی ہے؟

فقہاء نے جابجا یہ موقف پیش کیا ہے کہ والدین کی خدمت جہاد سے زیادہ افضل ہے، علاوہ ازیں جہاں فقہاء جہاد کے لئے والدین کی اجازت ضروری قرار دیتے ہیں، دلیل میں ایک حدیث پیش کرتے ہیں جو حدیث کی متعدد کتابوں میں نقل کی گئی ہے، روایت کے مطابق اللہ کے رسول سے حدیث کے راوی عبداللہ بن مسعود سوال کرتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک سب سے محبوب عمل کون سا ہے؟ آپ ﷺ جواب دیتے ہیں وقت پر نماز، پوچھتے ہیں پھر کون سا؟ آپ ﷺ کہتے ہیں والدین کی خدمت، پوچھتے ہیں پھر کون سا؟ آپ ﷺ جواب دیتے ہیں اللہ کے راستے میں جہاد۔ روایت کے الفاظ کی یہ ترتیب حدیث کی بیشتر کتابوں بشمول صحیحین میں ذکر ہوئی ہے، لیکن اس ترتیب پر سب راویوں کا اتفاق نہیں ہے۔ مستدرک حاکم، سنن دار قطنی اور سنن بیہقی کی سند کے پہلو سے مضبوط روایتوں میں جہاد کا تذکرہ والدین کی خدمت سے پہلے ہوا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ مذکورہ بالا ترتیب سے استدلال قوی نہیں ہے، علاوہ ازیں یہ بات اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ اس طرح کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ سائل کے حالات کی بھی رعایت کیا کرتے تھے، اس لئے علی الاطلاق کسی عمل کو کسی دوسرے عمل پر افضل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

کیا والدین کی خدمت ہمیشہ فرض عین ہے؟

فقہاء کے یہاں جہاد اور والدین کی اطاعت کے درمیان موازنہ اس طرح ہوتا ہے کہ جہاد عام حالات میں فرض عین ہے لہذا فرض عین فرض کفایہ پر مقدم ہے، حالانکہ خود والدین کی خدمت بھی اس

صورت میں فرض کفایہ ہونا چاہئے جبکہ ان کے ایک سے زائد سعادت مند بیٹے ہوں، ایسی صورت میں کوئی ان کی خدمت کے لئے یکسو ہو جائے اور کوئی اللہ کے دین کی خاطر جدوجہد کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے۔

ایک دلچسپ بحث

اہل علم کے درمیان ایک بحث چھڑی کہ ماں باپ دونوں میں سے کس کی اطاعت مقدم ہے؟ اکثریت کی رائے یہی کہ ماں کی اطاعت مقدم ہے، اور بعض نے یہ کہا کہ باپ کی اطاعت مقدم ہے، امام مالک کی رائے یہ سمجھی گئی کہ دونوں برابر ہیں۔ یہ بحث جس حدیث کی بنیاد پر چھڑی، حقیقت یہ ہے کہ اس کا تعلق اطاعت سے نہیں بلکہ حسن تعلق اور خدمت سے ہے۔ حدیث میں سائل کے الفاظ تھے، یا رسول اللہ من أحق الناس بحسن صحابتی؟ حسن تعلق کا سب سے زیادہ سزاوار کون ہے؟ جس کے جواب میں آپ ﷺ نے تین مرتبہ کہا تمہاری ماں اور چوتھی مرتبہ کہا تمہارا باپ۔ اطاعت کی بات نہ سوال میں تھی اور نہ جواب میں۔ (۴۴)

اس حدیث کا تعلق اطاعت کے بجائے خدمت اور حسن تعلق سے ہے، اس کی تائید سنن أبی داود کی ایک روایت سے ہوتی ہے، جس میں سائل نے پوچھا من أبر؟ جواب میں فرمایا: امک و أباک واختک واخاک ومولاک الذی یلی ذالک حقا واجبا ورحما موصولۃ۔ (۴۵)

امام غزالی کا موقف

امام غزالی لکھتے ہیں:

> اکثر علماء کا موقف ہے کہ والدین کی اطاعت حرام محض میں اگرچہ واجب نہیں ہے مگر شبہات میں واجب ہے، یہاں تک کہ اگر ان سے الگ رہ کر کھانا ان کو خراب لگتا ہو، تو تمہارے لئے لازم ہے کہ ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاؤ، کیوں شبہ سے بچنا پرہیزگاری ہے، اور والدین کو خوش رکھنا واجب ہے۔ اسی طرح کسی مباح یا نفل کام کے لئے ان کی اجازت کے بغیر تم سفر نہیں کر سکتے، فرض حج کے لئے جلدی نکلنا بھی نفل ہے کیونکہ وہ موخر کیا جا سکتا ہے اور علم کی طلب میں نکلنا بھی نفل ہے (امام صاحب نے دینی فرائض کے علم کو اس سے مستثنیٰ کیا ہے)۔ (۴۶)

مذکورہ بالا تعلیم کے نتیجہ میں بجا طور پر اولاد کا یہ ذہن بنتا ہے کہ حرام محض کے علاوہ تمام معاشرتی برائیاں جو گو کہ حرام محض کے دائرے میں نہیں آتی ہیں، مگر اپنے اثرات و نتائج کے لحاظ سے ان کا برائی ہونا واضح ہے، اور والدین ان پر بضد ہوں تو اولاد کو بھی ان میں شریک ہونا چاہئے۔

مثال کے طور پر شادی بیاہ کے موقعہ پر اگر والدین کا اصرار جہیز لینے پر ہو اور لڑکا اسے غلط سمجھے تب بھی والدین کی اطاعت کے تحت اسے ان کے اصرار کے آگے سر تسلیم خم کرنا چاہئے۔

اگر نئی نسل کے ہاتھ اس طرح کی بندشوں میں گرفتار رہیں گے تو غلط رسوم و رواج کے خلاف جہاد کس طرح ہو سکے گا۔

امام کاسانی کا اصول

امام کاسانی نے عام سفر پر نکلنے کے بارے میں ایک اصول ذکر کیا ہے۔

اصول یہ ہے کہ ہر وہ سفر جس میں ہلاکت کا اندیشہ ہو، اور خطرہ شدید ہو، بیٹے کے لئے باپ کی اجازت کے بغیر نکلنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ وہ اپنے بیٹے کے سلسلے میں مضطرب و پریشان رہیں گے، اور یہ اضطراب ان کے لئے باعث ضرر ہوگا، اور وہ ہر سفر جس میں خطرہ شدید نہ ہو وہ ان کی اجازت کے بغیر نکل سکتا ہے، بشرطیکہ اس کے پیچھے وہ ضیاع کا شکار نہ ہو جائیں، کیوں کہ اس میں ان کے لئے ضرر نہیں ہے، ہمارے مشائخ میں سے بعض نے ان کی اجازت کے بغیر سفر برائے علم کی اجازت دی ہے، کیوں کہ اس میں ان کا نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہے، اس لئے یہ حق تلفی کے دائرے میں نہیں آئے گا۔ (۴۷)

گویا اصل اہمیت اس کی ہے کہ فیصلہ والدین کے لئے ضرر رساں ہے یا ضرر رساں نہیں ہے، سوچنے کا یہ انداز برالوالدین اور احسان بالوالدین کی روح کے مطابق ہے۔ خطرہ کے ساتھ شدید کا وصف یہ بتاتا ہے کہ ایسے فیصلوں میں معمولی خطروں اور روزمرہ کے اندیشوں کی پرواہ نہیں کی جائے گی۔

احناف کا یہ اصول قرآنی تعلیمات کے مطابق ہے، اصل مطلوب والدین کی خدمت اور ان کی ضرورتوں کی تکمیل ہے، اگر اس کا انتظام ہو گیا ہے تو گویا بر اور احسان کا تقاضا پورا ہو گیا، اب اس کے بعد بیٹا کارزار حیات میں اترنے کے لئے آزاد ہے۔

اطاعت والدین کی ایک غلط نظیر

گو کہ راقم کو مذکورہ ذیل واقعہ کی صداقت پر ہی شبہ ہے، تاہم اگر اسے درست مان لیا جائے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اطاعت والدین کا زیر بحث تصور کیا گل کھلاتا ہے۔ واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ عمرو بن العاص نے اپنے بیٹے عبداللہ کی شکایت اللہ کے رسول ﷺ کے حضور کی، شکایت یہ تھی کہ عبداللہ رات بھر نماز پڑھتے ہیں اور دن بھر روزہ رکھتے ہیں، آپ ﷺ نے عبداللہ سے کہا، رات میں نماز بھی پڑھو اور سویا بھی کرو، دن میں کبھی روزہ رکھو کبھی بنا روزہ کے رہو، اور عمرو کی بات مانو، یا عبداللہ، صل ونم وصم وافطر، وأطع عمرا۔

اس کے برسوں بعد جنگ صفین کا موقعہ درپیش ہوا، عمرو بن العاص نے بیٹے سے ساتھ نکلنے کو کہا، مکالمہ اس طرح ہوا۔

باپ: نکلو اور جنگ کرو۔

بیٹا: آپ مجھے نکل کر جنگ کرنے کا حکم کیسے دے رہے ہیں، حالانکہ آپ سن چکے ہیں کہ ایسے مواقع کے سلسلے میں اللہ کے رسول ﷺ کی مجھ کو خاص نصیحت تھی۔

باپ: میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر یاد دلاتا ہوں کہ اللہ کے رسول ﷺ کا آخری عمل (ہمارے سلسلے میں) یہ تھا کہ آپ ﷺ نے تمہارا ہاتھ تھاما تھا اور اسے میرے ہاتھ میں رکھا تھا اور کہا تھا، جب تک عمرو بن العاص زندہ ہیں ان کی اطاعت کرنا۔

بیٹا: ہاں

باپ: تو میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ جنگ کرو۔

اس کے بعد وہ وقت بھی آیا جب عبداللہ کہتے تھے، میرا جنگ صفین سے کیا لینا دینا تھا، کاش میں اس سے بیس سال پہلے ہی مر گیا ہوتا۔ ہاں بخدا کی قسم، میں نے نہ تلوار چلائی اور نہ تیر چلایا۔ (۲۸)

اگر یہ سارے مکالمات درست مان لئے جائیں، تو بڑی تشویش ناک تصویر سامنے آتی ہے، جس میں بات یہ آتی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اگر باپ کی بات ماننے کو کہا بھی تھا تو خاص اس شکایت کے سلسلے میں کہا تھا جو عبداللہ کی شب بیداری اور روزہ داری کے سلسلے میں ان کے باپ عمرو بن العاص نے کی تھی، اور چونکہ شکایت ان کی جانب سے آئی تھی اس لئے یہ کہہ دیا کہ ان کی حیات بھر انہیں اس شکایت کا موقعہ نہ دو۔

پھر عبداللہ خود یہ کہہ رہے تھے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی نصیحت اس موقعہ کے سلسلے میں ان کے پاس ہے، جو انہیں اس جنگ میں شرکت سے روک رہی ہے، سوال یہ ہے کہ اللہ کے رسول کی ہدایت کے علی الرغم باپ کی بات کیسے مانی جا سکتی ہے؟

احسان کا ایک مقام، والدین کی دلداری

اگر والدین کی کوئی بات اس کے ضرر رساں پہلو کی بنا پر نا قابل قبول ہو، یا حقیقی مصالح کی خاطر والدین کے اختلاف سے پہلو تہی کرنا پڑے، تو بھی ان کی دل شکنی سے پرہیز اور اس سلسلے میں حکیمانہ رویہ اختیار کرنا ضروری ہے۔

والدین کے مفاد سے بالکل غیر متعلق بات بھی اگر نہیں مانی جاتی تو ان کا دل دکھنے کا اندیشہ رہتا ہے، چونکہ ذہنی سانچہ والدین کا بھی اس طرح بنا ہوا ہے کہ ہر معاملہ میں ان کا حکم واجب الاطاعت اور

ان کی رائے آخری ہونی چاہیے، اس لئے دل شکنی کے امکانات اور بڑھ جاتے ہیں۔

دل شکنی کے اس پہلو کی رعایت اہل علم کے یہاں دو طرح سے کی گئی ہے، ایک یہ کہ دل شکنی سے بچنے کے لئے آدمی اس عمل کا ارتکاب کرلے جس پر اس کا دل مطمئن نہ ہو، امام غزالی کا ذیل کا فتوی اس مسلک کی ترجمانی کرتا ہے، اگر ماں باپ میں سے کسی کا مال مشتبہ ہو، اور وہ اسے اس میں سے کھانے کو کہیں تو وہ بہت نرم روی کے ساتھ اس سے بچنے کی کوشش کرے، اگر بے بس ہو جائے، تو کھائے، اور وہ بھی اس طرح لقمہ چھوٹا کرے اور دیر تک چباتا رہے، اسی طرح اگر مشتبہ مال سے لیا ہوا کپڑا اسے پہننے کو کہیں، اور لوٹا دینے پر انہیں تکلیف ہوتی ہو تو قبول کرلے اور ان کے سامنے پہن بھی لے البتہ ان کی غیر موجودگی میں اتار دے، اور کوشش کرے کہ اس میں نماز نہ پڑھے الا یہ کہ ان کی موجودگی میں نماز پڑھنا پڑے۔ (۲۹)

دل شکنی سے بچنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اس عمل کے سلسلے میں ان کی بات تو نہ مانے، البتہ دوسرے طریقوں سے ان کے دل پر ہونے والے اثر کو زائل کرنے کی کوشش کرے۔ امام احمد کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

ایک موقعہ پر امام احمد نے کہا: اگر والدین اسے نفل نماز سے روکتے ہیں، تو وہ ان کی دلداری بھی کرے اور نماز بھی پڑھے۔

امام صاحب سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو باپ کی خاطر پہلی صف سے پیچھے رہ جائے، انہوں نے کہا مجھے اس کا پیچھے رہ جانا پسند نہیں ہے، وہ اپنے باپ کے ساتھ بر و احسان کے تقاضے دوسری طرح بھی پورے کر سکتا ہے۔ (۳۰)

فرض حج کے سلسلے میں امام احمد نے کہا: اگر تمہاری ماں تمہیں اجازت نہیں دے رہی ہے، اور زاد و راحلہ تمہارے پاس ہے، تو حج کرو اور اس کی اجازت کی پرواہ نہ کرو، ہاں اس کے ساتھ خاکسار ہو اور اس کی دلداری کرو۔ (۳۱)

درج ذیل مکالمہ سے بھی اس مسئلے پر روشنی پڑتی ہے، مکالمہ کے کردار ہیں امام احمد بن حنبل اور ان کے شاگرد مروذی۔

مروذی: کیا شبہات میں والدین کی اطاعت کی جائے گی؟

امام صاحب: جیسے کھانے میں؟

مروذی: ہاں

امام صاحب: مجھے یہ بھی پسند نہیں ہے کہ وہ مستقل ان کی بات مان کر شبہات پر قائم رہے، اور

مجھے یہ بھی پسند نہیں ہے کہ ان کی یکسر نافرمانی کرے، اسے چاہئے کہ ان کی دلداری کرے، اور آدمی کو والدین کے ساتھ شبہات پر قائم نہیں رہنا چاہئے۔

مروذی: فضیل کا قول ہے کہ جس کا متعین طور پر حرام ہونا معلوم نہ ہوا سے کھالو۔

امام صاحب: اسے کیسے پتہ چلے گا کہ کون سا حرام ہے۔

مروذی: بشر بن حارث سے پوچھا گیا تھا کیا شبہات میں والدین کی اطاعت کی جائے گی؟ انھوں نے کہا تھا کہ نہیں۔

امام صاحب: یہ تو بہت سخت ہے

مروذی: کیا شبہات میں والدین کی اطاعت کی جائے گی؟

امام صاحب: والدین کا حق تو ثابت ہے۔

مروذی: تو اس میں بھی ان کی اطاعت ہے،

امام صاحب: مجھے معاف کرو ....

مروذی: میں نے محمد بن مقاتل عبادانی سے پوچھا تھا اس بارے میں، انھوں نے کہا تھا اپنے والدین کے ساتھ بر کا معاملہ کرو۔

امام صاحب: محمد بن مقاتل کا یہ مرتبہ ہے، اور ان کی بات تمہارے سامنے ہے، بشر بن الحارث کا یہ مرتبہ ہے، ان کی بات بھی تمہارے سامنے ہے، (پھر کہا) کتنا اچھا ہوا گر وہ ان کی دلداری کرتا رہے، (۳۲)

مادی ضرورتوں کی تکمیل

احسان کا لازمی عنصر

فقہاء میں اس امر پر تو تقریباً اتفاق ہے کہ اگر والدین محتاج ہوں اور کمانے پر قادر بھی نہ ہوں تو براالوالدین کے تقاضے کے تحت بیٹے پر ان کا نفقہ واجب ہے، اس امر میں اختلاف ہے کہ اگر وہ کمانے کی قدرت رکھتے ہوئے بھی عملاً کسی ذریعہ معاش کو اختیار نہ کریں، تو کیا اس صورت میں بھی ان کے احتیاج کا لحاظ کر کے ان کا نفقہ واجب ہوگا؟

حنابلہ کا موقف یہ ہے کہ اس صورت میں بھی نفقہ واجب ہوگا اور احناف اور شوافع کے یہاں بھی قوی تر رائے یہی ہے گو کہ اس کے برعکس رائے بھی پائی جاتی ہے، مالکیہ کے یہاں قوی رائے عدم وجوب کی ہے جب کہ اس کے برعکس رائے بھی پائی جاتی ہے۔

علامہ ابن قیم کی رائے ہے کہ والدین اگر تندرست ہوں، اور کمانے کے لائق ہوں، تو بھی اپنے مال

... اور رہا براالوالدین کا ضروری ترین جزء ہے، انہوں نے اس رائے پر سخت تنقید کی ہے ... مطابق بیٹے پر باپ کا نفقہ صرف اس صورت میں واجب ہے جبکہ وہ بہت بوڑھا یا اندھا ہو گیا ... اس نقطہ پر بہت جذباتی ہو کر لکھتے ہیں:

براالوالدین یہ نہیں ہے کہ آدمی خوب مالدار اور خوشحال ہو، اور اپنے باپ کو چھوڑ دے کہ وہ گلیوں میں جھاڑو لگائے، گدھوں کو مزدوری پر چلائے، اور حمام کی بھٹی میں ایندھن جھونکے، یا اس کو چھوڑ دے کہ وہ لوگوں کے یہاں نوکرانی بن کر ان کے کپڑے دھوئے، اور پانی بھرے، اور اس کا خرچ دے کر اسے اس ذلت سے محفوظ نہیں رکھے، اور دلیل یہ دے کہ ماں باپ ... کمانے میں خود کفیل ہیں، اور ابھی بوڑھے اور اندھے نہیں ہوئے کہ ان کا خرچ مجھ پر واجب ہے، خدا کی پناہ، اللہ اور اس کے رسول نے براالوالدین اور صلہ رحمی میں یہ شرط کہاں رکھی ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بوڑھا یا اندھا ہو، صلہ رحمی اور براالوالدین اس پر نہ شرعاً موقوف ہے نہ لغۃً اور نہ عرفاً۔ (۳۳)

علامہ ابن حزم نے جہات اربعہ کے رشتہ داروں کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

ان میں سے جو کسب معاش پر قادر ہو خواہ وہ ذریعہ معاش حقیر کیوں نہ ہو، ان کا نفقہ واجب نہیں ہوگا، ماسوا والدین اجداد اور جدات اور بیویوں کے کہ اس کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اگر اس کے اندر استطاعت ہو تو حقیر ذریعہ معاش سے ان کو محفوظ رکھے۔ احناف میں سے ان لوگوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ اگر وہ کمانے کی قدرت رکھتے ہوئے بھی عملاً کسی ذریعہ معاش کو اختیار نہ کریں، تو اس صورت میں بھی ان کی احتیاج کا لحاظ کر کے اس کا نفقہ واجب ہوگا۔ انہوں نے دلیل میں قرآن مجید کی وہ آیت پیش کی جس میں اف کہنے سے منع کیا گیا ہے، وجہ استدلال یہ ہے کہ اپنی وسعت اور والدین کے احتیاج کے باوجود ان کا نفقہ نہیں دینا اور ان سے محنت اور کام کا مطالبہ کرنا، اف کہنے سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔

اسی ذیل میں یہ سوال بھی زیر بحث آتا ہے، کہ کیا اولاد کی تنگ دستی کی صورت میں بھی والدین کا نفقہ واجب ہوگا؟ اور فارغ البالی کس کو کہا جائے گا؟ شوافع اور حنابلہ کی رائے ہے کہ اگر اس کے اور اس کے بچوں کے آج اور آنے والی رات کے کھانے کے سوا بچتا ہے تو والدین کا نفقہ اس پر واجب ہوگا، مالکیہ کے برخلاف حنابلہ کا موقف یہ ہے کہ اگر اولاد کے اندر اتنا کمانے کی قدرت ہو جو اس کی ضرورت سے فاضل ہو کر والدین کے نفقہ کے کام آئے تو اس کو اس کمائی پر مجبور کیا جائے گا، مالکیہ کے نزدیک تنگ دست بیٹا اگر ہنرمند ہو تو بھی اس پر واجب نہیں ہے کہ کام کر کے اتنا کمائے کہ اپنے والدین پر خرچ کر سکے، اس سلسلے

میں احناف کا مفتی بہ قول ہے کہ اولاد صاحب نصاب ہو تبھی اس پر والدین کا نفقہ واجب ہوگا، جبکہ امام محمد کا موقف ہے کہ اگر انسان کھیتی سے کماتا ہے تو ایک ماہ کے اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے نفقہ سے فاضل رہنے پر خوشحال سمجھا جائے گا اور اگر مزدوری سے کماتا ہے تو روزانہ کی بچت کا اعتبار ہوگا، اور بعض حنفی فقہاء نے اس کے مطابق فتوی دینے کی سفارش بھی کی ہے۔ (۳۳)

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ والدین کی مادی ضروریات کا تعلق براہ راست اس احسان سے ہے جس کی تاکید قرآن مجید میں کی گئی ہے، قانونی ناپ تول اور ضابطہ بندیوں سے قطع نظر احسان کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر بیٹے کے پاس ایک وقت کا کھانا ہے اور باپ کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے تو بیٹا باپ کو اپنے اس کھانے میں شریک کرے جس طرح وہ باپ کرتا ہے جس کے ساتھ طفل بے مایہ ہو اور کھانے کے لئے صرف ایک وقت کا کھانا ہو، کما ربیانی صغیرا قرآنی دعا کا جزء ہی نہیں، انسانی رویہ کی اساس بھی ہے۔

حواشی

(۱) غیر مطبوعہ قرآنی حواشی، امام حمید الدین فراہی، سورہ مریم آیت نمبر ۳۰
(۲) فتاوی ورسائل شیخ محمد بن ابراہیم آل شیخ ج ۶ ص ۲۹ مطبعہ الحکومہ مکہ مکرمہ
(۳) الحاوی الکبیر، ماوردی، ۱۳/۱۲ دار الفکر بیروت
(۴) تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی ۴/۳۹۵۳
(۵) صحیح الترغیب والترھیب، محمد ناصر الدین البانی ۲-۶۵۱ مکتبہ المعارف ریاض
(۶) ناصر الدین البانی نے اسے حسن اور ترمذی نے حسن صحیح قرار دیا ہے صحیح الترغیب وصحیح الترھیب ۲-۶۵۱
(۷) نیل الاوطار، امام شوکانی ۱۰/۳۳۳، المکتبۃ الشاملۃ، الاصدار الثالث
(۸) فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، محمد عبد الروف مناوی، ۴/۳۲۶
(۹) www.panet.co
(۱۰) المنح علی اصلاح الجمع محمد بن سالم البیحانی، تحقیق، یحیی بن علی الحجوری، دار العاصمہ ۵۳۰
(۱۱) الآداب الشرعیۃ محمد بن مفلح ۲/۵۵ المکتبۃ الشاملۃ، الاصدارت الثالث
(۱۲) مجموع فتاوی شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ ۳۳-۱۱۲، مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف الشریف ۱۹۹۵ء
(۱۳) مجموع فتاوی شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ مجلد ۳۳ صفحہ ۱۱۲-۱۱۳، مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف الشریف ۱۹۹۵ء

(۱۴) من فتاوی العصر، مرتب مجدی فتحی آل کحیل، احمد بن شعبان بن احمد، مکتبۃ الصفا، ۲۷۸
(۱۵) مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے، (صحیح الترغیب والترھیب ۲-۳۴۷)
(۱۶) المنح علی اصلاح الجمع محمد بن سالم البیحانی، تحقیق، یحیی بن علی الحجوری، دار العاصمہ ۵۲۹، ۵۳۰
(۱۷) فتح الباری احمد بن علی بن حجر عسقلانی دار طیبہ ۱۳-۴۹۶
(۱۸) عمدۃ القاری محمود بن احمد العینی، دار الکتب العلمیہ ۲۲-۱۳۰
(۱۹) ایک نام طلحہ بن معاویہ کا بھی ہے، لیکن آیا طلحہ بن معاویہ سلمی کا واقعہ درست ہے؟ یا وہ جاہمہ سلمی کے پوتے اور ان کے واقعہ کے راوی ہیں اور محدثین بشمول البانی سے سہو ہو گیا ہے؟ تحقیق طلب ہے۔ ملاحظہ ہو صحیح الترغیب والترھیب ۲-۶۲۹
(۲۰) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ہیثمی، ۸/۵۶، ہیثمی نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔
(۲۱) ناصر الدین البانی نے اسے صحیح لغیرہ قرار دیا ہے صحیح الترغیب والترھیب ۲-۶۲۸
(۲۲) معجم صغیر طبرانی، ۱/۱۳۰ تحقیق محمد شکور امریر، المکتب الاسلامی بیروت
(۲۳) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، حافظ ہیثمی، ۵/۳۸۷، حدیث نمبر ۹۲۲۸، دار الفکر بیروت
(۲۴) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب البر والصلۃ
(۲۵) سنن ابی داود، باب فی بر الوالدین ۵۱۱۸
(۲۶) احیاء علوم الدین، ابوحامد غزالی، عالم الکتب ۲/۱۹۴
(۲۷) بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، کاسانی، ۱۵/۲۱۷، المکتبۃ الشاملۃ، الاصدار الثالث
(۲۸) سیر اعلام النبلاء، ذہبی، تحقیق شعیب ارناؤط، ۳/۹۲ - اسد الغابہ، ابن اثیر، ۲/۱۵۸
(۲۹) مغنی المحتاج، ۱۰/۲۳۹، المکتبۃ الشاملۃ، الاصدار الثالث
(۳۰) الفروع محمد بن مفلح المقدسی، ۵/۴۴۱ المکتبۃ الشاملۃ، الاصدار الثالث
(۳۱) الفروع، ابن مفلح، ۵/۴۴۰ المکتبۃ الشاملۃ، الاصدار الثالث
(۳۲) الآداب الشرعیۃ، ابن مفلح ۲/۵۱ المکتبۃ الشاملۃ، الاصدارت الثالث
(۳۳) زاد المعاد، ابن قیم، ۵/۴۸۳ موسسۃ الرسالۃ بیروت
(۳۴) متعلقہ حوالوں اور تفصیلی گفتگو کے لئے ملاحظہ فرمائیں (المفصل فی احکام المرأۃ والبیت المسلم فی الشریعۃ الاسلامیۃ، ڈاکٹر عبد الکریم زیدان ۱۰/۱۸۳ تا ۱۹۶، موسسۃ الرسالۃ)

میرے بھیا، میرے محسن، میرے مربی

اقبال احمد اصلاحی ندوی مدنی*

میری پرورش اور تعلیم وتربیت میں جس نے اہم کردار ادا کیا ہے، عورتوں میں میری بہن جمیلہ اور مردوں میں میرے بھیا مولانا شبیر احمد اصلاحی۔ ابھی میں چند سال کا تھا کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ میرے والد صاحب اکثر سفر میں رہتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اور دیکھ بھال میری بہن اور دادا اور بھیا کرتے تھے۔

میرے بھیا میرے لئے جہاں ایک مہربان بھائی تھے، وہیں میرے لئے وہ ایک محسن، اور مربی اور شفیق باپ کی حیثیت سے تھے، ایک باپ جس طرح اپنی اولاد کو دینی، دنیوی، علمی اور اخلاقی اعتبار سے بہت اونچا دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی طرح میرے بھیا بھی ہر طرح کی خوبیوں سے آراستہ مجھے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں کسی طرح کی سستی اور لاپرواہی نہیں کرتے تھے، میرے بھیا کو بچپن ہی سے میری تعلیم وتربیت اور اچھی پرورش کی فکر رہا کرتی تھی، جہاں بھی رہا ہمیشہ اپنے قیمتی مشوروں اور نصیحتوں سے رہنمائی کیا کرتے تھے۔ ہر کام میں ہمت بندھاتے تھے۔ میں بھی ہر موڑ، اور ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں، چاہے میرا ذاتی ہو یا بچوں کا برابر مشورہ طلب کرتا رہتا اور رائے لیتا رہتا تھا اور ان پر عمل کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ لیکن اب کس سے مشورہ لوں گا اور کون میری دلجوئی کرے گا۔

ولمن اقول اذا تلم ملمة

ارنی برایک ام الیٰ من الفزع

بھیا میری سادہ لوحی اور کم گوئی اور میری زود حسی سے بہت فکر مند اور پریشان رہا کرتے تھے، ذرا سی بات پر گھنٹوں، بلکہ دنوں سوچا کرتے تھے، میری اچھی تعلیم کے لئے بھی بہت فکرمند رہا کرتے تھے۔ ابھی میں جامعہ مفتاح العلوم مئو میں پرائمری میں تھا اور وہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں زیر تعلیم تھے۔ ۱۹۵۱ء میں مدرسۃ الاصلاح لے گئے، کہ اپنی نگرانی میں رکھیں گے اور دیکھ بھال کریں گے۔ عربی اول میں داخلہ ہوا، بھیا کا آخری سال تھا، لیکن والد صاحب کی سخت علالت، اور کچھ گھریلو پریشانیوں کی وجہ سے درمیان سال ہی میں مدرسہ چھوڑنا پڑا، چونکہ ابھی میں نیا تھا، پہلی بار گھر سے اتنی

*جمال پوروہ، مئو ناتھ بھنجن

اور باہر آیا تھا۔ مدرسہ کا کھانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ چھوڑنے سے پہلے اپنے ایک ساتھی محمد انصار صاحب ان کا باورچی خانہ سے کچھ تعلق تھا، کھانے پینے کے سلسلہ میں دیکھ بھال اور مدد کرنے کا ذمہ دار بنا گئے۔ اور مولانا شہباز صاحب اصلاحی (مرحوم) جن سے بھیا کے بہت گہرے مخلصانہ اور برادرانہ تعلقات تھے، کی رہنمائی اور نگرانی میں کر گئے۔ بھیا کے جانے کے بعد مولانا نے بھیا کی کمی محسوس نہیں ہونے دی، برابر میرا خیال رکھتے، ہمیشہ خیریت معلوم کرتے، چونکہ اردو میں بہت کمزور تھا، چھوٹی چھوٹی دینی اصلاحی کہانیوں کی کتابیں لاکر دیتے اور پوچھا کرتے، ان کے بڑے بھائی ماسٹر محمد عالم صاحب بھی بہت خیال رکھتے۔ جب کبھی بیمار ہوتا مدرسہ کے اسپتال میں جاتے، ڈاکٹر کو دکھاتے، دوا دلاتے اور پابندی سے وقت پر دوا کھانے کی تاکید کرتے۔

عربی سوم میں قرآن مجید مولانا مرحوم کے ذمہ تھا، برابر سمجھ کر پڑھنے کی تاکید کرتے۔ یاد کرنے پر زور دیتے انھیں کے زمانہ میں سورہ حدید سے سورہ ناس تک یاد کرلیا تھا۔ مولانا نے تاج کمپنی کا چھوٹے سائز کا ایک خوبصورت قرآن شریف دیا، جو آج تک موجود ہے۔

مدرسۃ الاصلاح سے فراغت کے بعد ندوۃ العلماء میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی خواہش اور شوق تھا۔ بھیا نے میرے اس شوق کو بھی اپنے مخلص ساتھی حضرت مولانا سعید الرحمن صاحب ندوی کے واسطہ سے پورا کیا۔ مولانا کے توسط سے تخصص فی الادب العربی کے دوسرے سال میں داخلہ مل گیا۔ مولانا مدظلہ بھیا کے بہت گہرے اور مخلص ساتھی ہیں۔ دونوں نے ایک ساتھ الٰہ آباد بورڈ کے عالم و فاضل کا امتحان دیا۔ مولانا مدظلہ ندوۃ العلماء کی طالب علمی کے زمانہ میں میرا بہت زیادہ خیال رکھتے۔ برابر خیریت معلوم کرتے، کسی بھی چیز کی ضرورت ہوتی فوراً پوری کرتے، اپنی قیمتی نصیحتوں سے نوازتے رہتے۔ ہر طرح کی مدد کرتے۔

جب میں ندوہ سے فارغ ہوا تو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا قیام عمل میں آچکا تھا، میری بھی دلی خواہش تھی کہ وہاں پڑھوں اور اس مقدس سرزمین میں رہنے کی سعادت حاصل کروں، یہ خواہش اور سعادت بھی حضرت مولانا مدظلہ کی وساطت سے حاصل ہوگئی۔ حضرت مولانا کی شفقت اور ہمدردی میرے ساتھ آج تک قائم ہے۔ اب بھی ایک چھوٹے بھائی کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ جب بھی حاضر خدمت ہوتا ہوں بہت خوش ہوتے ہیں۔ کھانے پر بلاتے ہیں، مہمان خانہ میں قیام کا انتظام کرا دیتے ہیں، اللہ سے دعا ہے مولانا کی یہ شفقت اور یہ تعلق تادم حیات باقی رہے۔ یہ سعادتیں بھیا ہی کی وجہ سے تو حاصل ہیں۔

نائجیریا سے واپسی کے بعد برابر بھیا کی خدمت میں حاضر ہوتا، جو خواہش اور ضرورت ہوتی

پوری کرنے کی کوشش کرتا، وہ شروع سے مجھے بابو کہہ کر بلاتے۔ اس عمر میں بھی بابو ہی کہتے۔ جب بھی حاضر خدمت ہوتا، بچے چڑھ جاتے، کہتے آپ کے بابو آگئے۔ اب تو ہم لوگوں سے کوئی مطلب نہیں رہے گا۔ میری حاضری سے بہت خوش ہوتے، ایک ایک بچے کی خیریت معلوم کرتے ان کو دعائیں دیتے۔ یوسف، عذرا اور لبنیٰ کو بہت یاد کرتے لبنیٰ کو خاص طور پر یاد کرتے۔ وہ ان کے یہاں کئی ماہ رہ چکی تھی، ان سے بہت بے تکلف ہو گئی تھی۔ اس نے ان کا بیڑی پینا چھڑا دیا تھا۔ علالت کے آخری ایام میں بھی ان کو ہمیشہ میرا انتظار رہتا تھا جب بھی خیریت معلوم کرنے کے لئے فون کرتا، پوچھتے کب آرہے ہو؟ بغرض علاج جب ان کو اعظم گڑھ اقصیٰ اسپتال لے گئے، وہاں جب بھی ان کو محسوس ہوتا کہ میں ان کے قریب ہوں، فوراً میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے۔ آنکھوں سے لگاتے، سینہ سے لگاتے اور دعا دیتے اور اپنے پاس سے اٹھنے نہ دیتے۔ ان کی خواہش ہوتی کہ ان کے پاس ہی رہوں۔ سچی بات ہے کہ بھیا کے میرے اوپر اتنے احسانات ہیں کہ ان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

بھیا اپنے بچوں اور ان کی اولاد کو علمی، اخلاقی میدان بہت اونچا دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے اپنے بچوں کو اور ان کی اولاد کو جامعۃ الفلاح میں داخل کرایا، اور تعلیم دلائی اور اپنے تمام بیٹے، بیٹیوں کی شادی دیندار گھرانے میں کی۔ یہی وجہ ہے کہ سبھی بچے دیندار اور با اخلاق ہیں۔

بھیا کی محبت اور شفقت اور دردمندی اپنے بچوں اور گھر والوں سے لے کر اہل خاندان اور اقارب تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان کو اپنے خاندان اور رشتہ داروں کی بھی فکر رہا کرتی تھی۔ ان کے ہر دکھ درد، اور خوشی و غم میں برابر شریک ہوتے اور ان کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ سے دلچسپی رکھتے، ان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ جس حد تک ممکن ہوتا ان کے کام آتے ان کی مدد کرتے، ان کے اندر خدمت کرنے کا بے انتہا جذبہ تھا، کوئی بھی بیمار ہو جاتا، خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو، اس کی خدمت اور مدد کے لئے تیار ہو جاتے، انھوں نے اپنے والد، دادا اور بڑے بھائی کی بیماری میں بے انتہا خدمت کی۔ ان کے پیشاب اور پاخانہ سے تر بستر کو ندی لے جاتے اور اپنے ہاتھ سے دھوتے کبھی نہیں گھبراتے، نہ گھن کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس خدمت اور نیکی کا بدلہ اس دنیا ہی میں اس طرح دیا کہ ان کی بچیوں، بہوؤں اور پوتی اور بیٹوں نے ان کی طویل بیماری کی حالت میں بغیر گھبرائے بغیر شکوہ کئے جس طرح خدمت کی اس کی بھی مثال کم ملے گی۔ خاص کر ان کی پوتی سمیہ اور اس کی ماں ان کی ہر طرح خدمت کرتی رہی۔ ان کی خدمت ہی کی وجہ سے پڑھائی میں توجہ نہیں دے پاتی تھی، بلکہ فیل بھی ہو گئی، بھیا بھی اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ برّوا آبائکم تبرّ ابنائکم کے صحیح مصداق تھے۔ انھوں نے اپنے باپ، دادا اور بھائی کی دل و جان سے خدمت کی، ان کے بچوں نے ان کی ہر

طرح کی خدمت کی، ان کی جھڑکیاں کھائیں، مار تک کھائی لیکن خدمت سے کبھی منہ نہیں موڑا۔

حادثہ سے قبل برابر اپنے گاؤں بھٹا ورتنج جایا کرتے، لوگوں کو اکٹھا کرتے۔ ان کے آپس کے اختلافات کو دور کرتے۔ ان میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ خاندان میں ان کی حیثیت ایک سردار کی تھی۔ سب ان کا احترام و عزت کرتے۔ ہر معاملہ میں ان سے مشورہ لیتے۔ ان کے فیصلے کو قبول کرتے، خاندان کی بچیوں کو اپنی بچیوں کی طرح نصیحت کرتے۔ پردہ کرنے پر زور دیتے، بے پردگی سے ناراض ہوتے، سختی سے منع کرتے بچیوں کے لئے ایسے اشعار کہتے جن میں دین کی باتیں ہوتیں۔

جامعہ اور جامعہ کے اساتذہ و طلبہ سے تعلق اور لگاؤ

بھیا مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر چھوڑنے کے بعد مختلف مدارس میں تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ آخر میں ۱۹۶۰ء میں بلریا گنج مکتب اسلامی (موجودہ جامعۃ الفلاح) میں تعلیم و تدریس اور تربیت کا فریضہ انجام دینے کے لئے آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یہاں آنے کے بعد ان کو ایک ہی دھن تھی اور ایک ہی لگن تھی کہ یہ مکتب ایک معیاری جامعہ اسلامیہ بن جائے۔ ندوۃ العلماء اور مدرسۃ الاصلاح کی طرح دین کی مکمل تعلیم ہو۔ اس میں علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ علوم عصریہ کی بھی تعلیم دی جائے، اس سے فارغ ہونے والے کسی میدان میں پیچھے نہ رہیں، اور "جو گروہی، جماعتی اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر معاشرہ کی اصلاح و تعمیر کا فریضہ انجام دے سکیں۔" اپنی اس خواہش اور منصوبے کو بروئے کار لانے کے لئے برابر تگ و دو کرتے رہے۔ مدرسہ کا دائرہ اور درجات بڑھاتے رہے۔ لیکن ان کے اس جذبہ اور خواہش کی شروع شروع میں ہمت افزائی اور پذیرائی بہت کم لوگوں نے کی بلکہ زیادہ تر لوگ ایک پاگل کی بڑ سمجھتے، مگر ڈاکٹر خلیل احمد اور ماسٹر جنید اور مولانا عیسیٰ صاحب جیسے حضرات برابر ہمت افزائی کرتے رہے، حوصلہ بڑھاتے رہے اور ان کی کوششوں کو سراہتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت جلد ان کی اس دیرینہ خواہش کی تکمیل کی صورت پیدا فرمادی اور ان کا دیرینہ خواب بہت جلد پورا ہو گیا، اور ان کے جیتے جی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کے منصوبے اور پلان کے مکمل ہونے کی صورت نکل آئی اور ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ چند سال کے اندر مکتب نے جامعہ کی صورت اختیار کر لی اور اسلامی مکتب جامعۃ الفلاح کے نام سے جانا جانے لگا۔ اس جامعہ نے چند سال کے اندر جو اعلیٰ مقام حاصل کیا شاید ہی کسی جامعہ نے اتنی قلیل مدت میں اتنا اونچا مقام اور اتنی زیادہ شہرت، داخل ہند اور بیرون ہند حاصل کی ہو۔ جامعہ کو ایسے اساتذہ مل گئے جو انتہائی قابل اور اپنے فن میں ماہر

تھے، مولانا شہباز اصلاحی جیسا ہمہ گیر صلاحیت کا مالک اور مولانا جلیل احسنؒ ندوی جیسا ماہر تفسیر و ادب مل گئے، اور بعد میں بھی مولانا عبدالحسیب اصلاحی، مولانا ابوبکر اصلاحی، مولانا عنایت اللہ اصلاحی سبحانی جیسے لائق اور قابل، ماہر فن اساتذہ مل گئے جس سے جامعہ کو چار چاند لگ گیا۔ اس کی شہرت بیرون ملک عرب ممالک کے علاوہ مغربی ممالک تک جا پہنچی، اور پڑھنے کے لئے مدرسہ کاشف العلوم، چتر پور، ضلع ہزاری باغ کے بہت سے طلبہ یہاں آگئے اور ایک ساتھ کئی عربی درجات کھل گئے۔

جامعہ کا نام جامعۃ الفلاح کیسے پڑا؟

بھیا برابر سوچا کرتے تھے کہ اس مدرسہ اسلامیہ سے فارغ ہونے والوں کا کس نسبت سے تعارف ہو، جس طرح ندوۃ العلماء کے فارغین ندوہ کی نسبت سے ندوی اور مدرسۃ الاصلاح کے فارغین اصلاحی کہے جاتے ہیں۔ اس مدرسہ کا بھی کوئی ایسا نام ہونا چاہیے جس کی طرف نسبت کرکے تعارف ہو، ایک رات جب وہ سو رہے تھے، سنا کوئی کہہ رہا ہے کہ اس مدرسہ کا نام جامعۃ الفلاح رکھا جائے، بھیا کو یہ نام بہت پسند آیا۔ اور بہت خوش ہوئے اور جامعہ کی مجلس انتظامیہ میں پیش کیا۔ سب نے اس کو پسند کیا اور اس کے بعد سے مکتب اسلامیہ کا جامعۃ الفلاح نام ہو گیا۔

جامعہ اس کے اساتذہ و طلبہ
اور متعلقین سے تعلق اور محبت

جامعہ اور اس سے تعلق رکھنے والوں سے یہ یک گونہ محبت ہی تو ہے کہ ۱۹۸۲ء میں ان پر قاتلانہ حملہ کرنے میں جو بھی شریک تھے، ان سب کو انھوں نے معاف کر دیا کہ ان کا جامعہ سے کسی نہ کسی درجے میں تعلق تھا۔ جامعہ سے عشق ہی تو ہے کہ ان کی طویل بیماری کے زمانے میں ان کی بچیاں اپنے گھر (سسرال) خدمت اور دیکھ بھال کے لئے لے جانا چاہتی تھیں۔ ان کے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر مجاہد الاسلام نے اپنے یہاں دہلی لے جانے کے لئے کئی بار کوشش کی تا کہ وہاں ان کی طبی اور جسمانی خدمت ہو سکے، صرف ایک دفعہ بغرض علاج گئے، اس کے بعد پھر نہیں گئے، میں نے بار بار چاہا کہ مئو رہیں، تمام رشتہ دار تو یہیں ہیں، ان کو بھی خدمت کا موقع ملے گا۔ لیکن باوجود بچیوں اور مجھ سے غایت درجہ محبت کے جامعہ سے دور رہنا پسند نہیں کیا۔ جامعہ اور جامعہ کے اساتذہ وطلبہ سے جو قلبی اور ذہنی رشتہ تھا وہ خونی رشتہ سے کہیں زیادہ مضبوط اور بڑھا ہوا تھا۔ اور ان کی یہی خواہش تھی کہ موت آئے تو جامعہ کے قرب و جوار میں آئے اور یہ جامعہ کے قبرستان میں اپنے مشفق استاذ مولانا جلیل احسن ندوی (نور اللہ مرقدہ) اور مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی رحمہ اللہ کے جوار میں مدفون ہوں، اللہ تعالیٰ نے ان کی دونوں خواہشیں پوری فرمادیں۔

بھیا پہلے کافی صحت مند اور چاق و چوبند تھے۔ ہر کام وقت پر انجام دیتے تھے لیکن ۱۹۸۲ء کے حادثہ کے بعد سے جس میں ان کا داہنا ہاتھ مفلوج اور زبان بھی کافی متاثر ہو گئی تھی کہ ان کی بات پورے طور پر نہیں سمجھ میں آتی تھی، آہستہ آہستہ کمزور ہوتے گئے، صحت بھی گرتی گئی۔ ادھر ایک سال سے صحت کافی متاثر ہو گئی اور کمزور ہوتے گئے، دو مہینے سے اور زیادہ کمزور اور صحت خراب سے خراب تر ہوتی گئی، کبھی کبھی ہوش و حواس کھو بیٹھتے۔ کسی کو نہیں پہچانتے اور کئی بار تو ایسی طبیعت خراب ہو جاتی کہ ان کی زندگی سے مایوسی ہونے لگتی۔ لیکن پھر سنبھل جاتے۔ وفات سے آٹھ دس روز پہلے بے چین رہنے لگے۔ سینہ سے گھڑ گھڑاہٹ کی آواز نکلتی۔ آخری دنوں میں بلغم اتنا جم گیا تھا کہ سانس لینے میں سخت دشواری ہوتی۔ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ کھانس نہیں سکتے تھے کہ بلغم نکل سکے۔ بالآخر ڈاکٹروں کے مشورے سے اعظم گڑھ فضلی اسپتال لے جائے گئے، پانچ روز تک اسپتال میں ایڈمٹ تھے۔ مشین سے بلغم نکالا گیا اور کمزوری کے لئے برابر ڈرپ چلتی رہی۔ کسی قدر جب حالت بہتر ہوئی تو ڈاکٹر نے ڈسچارج کر دیا اور ۳۱ ردسمبر کو بلریا گنج واپسی ہوئی۔ چونکہ حالت بظاہر بہتر معلوم ہو رہی تھی اس لئے میں دو ایک روز کے لئے مئو چلا گیا، صرف ایک دن گزرا تھا کہ ایک بجے عابدہ کا فون آیا کہ ابا اس دنیا میں نہیں رہے۔ زبردست شاک لگا دل و دماغ پر ایک سکتہ طاری ہو گیا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ جس بھائی کو قابل اطمینان حالت میں چھوڑ کر آیا تھا وہی ہمیشہ ہمیش کے لئے ہم سے جدا ہو جائیں گے۔ ڈھائی گھنٹے کے اندر بلریا گنج پہنچ گئے، جانے کے بعد بچوں نے بتایا کہ شام سے ہی بے چینی اور گھڑ گھڑاہٹ میں اضافہ ہوتا گیا۔ حالت گرتی ہی جا رہی تھی۔ سب بچے دعا و قرآن پڑھ رہے تھے۔ عابدہ بھیا کو اپنی گود میں لئے زور زور سے کلمہ طیبہ، دعا اور قرآن شریف پڑھ رہی تھی جب سورہ یوسف (۱۰۱) انت ولی فی الدنیا والآخرۃ توفنی مسلما والحقنی بالصالحین پڑھنا شروع کیا، بھیا نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور یکایک بے چینی اور گھڑ گھڑاہٹ ختم ہو گئی۔ عابدہ اپنی ناتجربہ کاری سے اصل بات نہ سمجھ سکی، اس نے سمجھا کہ ابو کو آرام مل گیا۔ لٹانے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ اس نے نہیں سمجھا کہ وقتی آرام نہیں، بلکہ دنیا کی کلفتوں سے ہمیشہ ہمیش کے لئے آرام مل گیا اور زندگی بھر کا تھکا ہوا مسافر بہتوں کو سوگوار چھوڑ کر اپنی منزل کو جا پہنچا۔ رب رحیم آقا کے حضور پہنچ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مولائے رحیم و کریم سے دعا ہے کہ بھیا کی بال بال مغفرت فرمائے، ان کی اچھائیوں کو قبول فرمائے، کمزوریوں، لغزشوں، گناہوں کو معاف فرمائے۔ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور ان کی تربت کو ٹھنڈی رکھے، پسماندگان کو صبر جمیل اور ہمت دے۔

جانے والے چلے تو جاتے ہیں — زخم گہرا لگا کے سینے میں
وقت مرہم سہی، مگر سچ ہے — لطف آتا نہیں ہے جینے میں

اللہ تعالی نے بھیا کو جہاں ایک طرف تعلیم وتدریس اور تربیت کی بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا، وہیں ان کو بہترین انتظامی صلاحیت بھی عطا فرمایا تھا۔ تحریر وتقریر کا بھی بہترین ملکہ تھا۔ دعوت وتبلیغ کے لئے جہاں جاتے اچھے انداز میں دعوت اسلامی پیش کرتے۔ ان کا اصل میدان تعلیم وتدریس و تربیت اور دعوت دین تھا۔ لیکن کبھی کبھی مضامین بھی لکھتے۔ بچوں کے لئے اصلاحی نظمیں بھی کہتے، جو مختلف پرچوں میں شائع بھی ہوئیں۔ بہترین خوش نویس بھی تھے، جامعہ کی عمارت کے اوپر جامعۃ الفلاح ان کی خوش نویسی کی بہترین یادگار ہے۔ انھوں نے کوئی زیادہ تحریری سرمایہ نہیں چھوڑا، چند غیر مطبوعہ مسودے ہیں جو ان کے بچوں کے پاس ہیں۔ جیسے مختصر منتخب احادیث کا مجموعہ مع ترجمہ وشرح۔ نحو وصرف کے ماہر تھے اس سے متعلق بھی ایک مسودہ ہے۔ سراجی بھی پڑھاتے تھے اس کے متعلق ایک غیر مطبوعہ مسودہ ہے۔ اسی کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں ایسے طلبہ چھوڑے ہیں جو دین اور علم کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ ان کے حق میں دعا کرتے رہیں گے۔

طبیعت میں بڑی سادگی، تواضع اور قناعت تھی۔ بچوں سے شفقت، بڑوں اور اساتذہ کی عزت اور احترام کرتے تھے۔

☆ ۵ محرم ۱۳۵۰ھ بختاور گنج، مئو کے ایک دیندار اور معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔
☆ ابتدائی تعلیم گھر اور دار العلوم مئو میں ہوئی۔
☆ اعلی اسلامی تعلیم ہندوستان کی مشہور درس گاہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں ہوئی۔
☆ جامعہ مفتاح العلوم مئو سے سند فضیلت حاصل کی۔
☆ الہ آباد بورڈ سے عالم، فاضل کی ڈگری حاصل کی۔
☆ ۲۸ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ مطابق ۶ دسمبر ۲۰۱۰ء کو رب رحیم آقا کے حضور پہنچ گئے۔
☆ بھیا نے اپنے پیچھے دو بیٹے خورشید انور، ڈاکٹر مجاہد الاسلام اور چار بیٹیاں عابدہ، خالدہ، راشدہ اور شاکرہ اور ایک بہن جمیلہ اور ایک بھائی اقبال احمد مدنی چھوڑا۔

بھیا طالب علمی کے زمانہ ہی میں جماعت اسلامی کے رکن ہوگئے تھے۔ اور تادم حیات اس سے منسلک رہے۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

جامعہ کے لیل ونہار

عبدالرقیب فلاحی

ریسرچ اسکالر اقوام متحدہ ریاض آفس وامیر جماعت اسلامی ریاض، سعودی عرب، جناب حفیظ الرحمن فلاحی صاحب نے ۱۳ نومبر ۲۰۱۰ء کو ابو اللیث ہال میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے ہندوستان اور عالمی پس منظر میں مسلمانوں کی موجودہ صورتحال اور ان کو درپیش چیلنجز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مغربی طاقتیں مسلمانوں کا عرصۂ حیات تنگ کردینا چاہتی ہیں اور بات یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ وہ آج مسلمانوں کی نمازوں پر بھی پابندی لگا رہی ہیں۔

انھوں نے سوئزر لینڈ میں میناروں پر لگی پابندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کے پیچھے یہودیوں کی سازشی ذہنیت کارفرما ہے۔ اسلام کا ہر شعار ان کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہا ہے۔ کیوں کہ اسلام دنیا میں ایک تیزی سے ابھرتی ہوئی طاقت کے طور پر اپنے آپ کو تسلیم کروا رہا ہے۔ موصوف نے مادر علمی میں اپنے سہ روزہ قیام کے دوران جامعہ کے جملہ شعبہ جات کا معائنہ کیا اور طلبہ سے انفرادی واجتماعی ملاقاتیں کرکے ان کی حوصلہ افزائی ورہنمائی کی۔

جمعیۃ الطلبہ کی سرگرمیاں

(الف) جمعیۃ الطلبہ کی جانب سے مورخہ ۲ دسمبر ۲۰۱۰ء کو ابو اللیث ہال میں "برجستہ تقریری مقابلہ" کا انعقاد ہوا۔ جس میں نامزد دس طلبہ نے حصہ لیا اور حسب تفصیل ذیل پوزیشن حاصل کی۔

﴿۱﴾ عاقب جاوید	عربی چہارم	I
﴿۲﴾ تابش ذکی	عربی چہارم	II
﴿۳﴾ مظفر حسین	عربی چہارم	III

اس میں حکم کے فرائض محترم مولانا مطیع اللہ فلاحی صاحب ومولانا اعجاز احمد قاسمی صاحب نے انجام دیے۔

(ب) قمری مہینہ سے برتی جارہی غفلت کے پیش نظر جامعہ میں امسال جمعیۃ الطلبہ کی جانب سے ایک مبارک سلسلہ کا آغاز کیا گیا ہے کہ ہر قمری ماہ کی پہلی تاریخ کو یاد دہانی کے طور پر متعلق ماہ کے

فضائل و مناقب سے طلبہ کو آگاہ کیا جائے، کیوں کہ مدارس میں بھی قمری تاریخوں کے استعمال میں کوتاہی برتی جانے لگی ہے اور اس کے استعمال میں دھیرے دھیرے کمی ہوتی جارہی ہے۔

چنانچہ جمعیۃ الطلبہ نے یکم صفر المظفر ۱۴۳۲ھ مطابق ۶/جنوری ۲۰۱۱ء کو اس سنہرے پروگرام کا باضابطہ آغاز کرتے ہوئے جامعہ کی مسجد میں ایک تذکیری پروگرام کا اہتمام کیا، جس میں محترم مولانا اخلاق احمد کریمی صاحب سے استفادہ کیا گیا۔

جملہ وابستگان جامعہ کو صدمہ

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

۱۳/دسمبر ۲۰۱۰ء بروز سوموار جامعہ کے ایک خادم محمد فاروق بن ادریس صاحب اچانک دل کا دورہ پڑنے سے اپنے اہل خانہ و جملہ وابستگان جامعہ کو سوگوار چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحوم پچاس برس کے تھے۔ آپ ۱۹۸۲ء میں جامعہ تشریف لائے اور آخری دم تک جامعہ کے دفتر نظامت سے منسلک رہے۔ دفتری امور سے متعلق کسی بھی معاملہ میں آپ مرجع تھے۔ جب کوئی کام ہو، کوئی مسئلہ درپیش ہو تو ہر شخص کی زبان پر فاروق صاحب کا نام آتا اور آپ اس کام کو آسانی سے حل کر دیتے۔ آپ کی شخصیت دفتر نظامت کی ڈکشنری کی حیثیت رکھتی تھی۔ دفتری امور میں آپ کا طویل تجربہ تھا۔ آپ خاموش طبع اور متحمل مزاج انسان تھے۔ عوامی رابطہ کی جگہ بہت نازک ہوتی ہے، ایسی جگہوں پر صبر و تحمل اور قوت برداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ خوبی مرحوم میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ آپ انتہائی محنتی، بااخلاق اور ملنسار تھے۔ آپ کی وفات سے جامعہ میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور جامعہ کو ان کا نعم البدل عطا کرے۔ آمین۔

مرحوم اپنے پیچھے اہلیہ کے علاوہ دو بچوں اور چار بچیوں کو چھوڑ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی کفالت کی کوئی بہتر سبیل پیدا فرمائے۔ آمین۔

مرکز تعلیم اساتذہ کی مجلس تعلیمی کی نشست

جامعۃ الفلاح کی اولیات میں سے ایک اختراعی کام جامعہ کے حدود میں ''مرکز تعلیم اساتذہ'' کا قیام بھی ہے۔ اس نوتشکیل شدہ ادارہ کی ایک مجلس تعلیمی (Academic Council) بھی ہے۔ اس کا پہلا باضابطہ اجلاس ۹، ۱۰/اکتوبر ۲۰۱۰ء کو جامعہ میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں مرکز کے سربراہ ڈاکٹر ابرار اعظمی صاحب کے تیار کردہ نصاب پر نظریاتی اور عملی اعتبار سے پیش کردہ نکات پر تفصیل سے غور و

فکر کیا گیا تھا۔

کام خاصہ بڑا ہے اور انتہائی جدید نوعیت کا۔ اسی لئے بحث و گفتگو کی تکمیل نہیں ہو سکی۔ لہٰذا طے کیا گیا کہ نصاب حتی الامکان مکمل کرنے کے لئے اس مجلس کا دوسرا ورکشاپ ۱۴، ۱۵/جنوری ۲۰۱۱ء کو اورنگ آباد میں منعقد کیا جائے۔

اس لئے مذکورہ تاریخوں میں شہر اورنگ آباد کے سہارا ہوٹل کے کانفرنس ہال میں تین نشستوں پر مشتمل ایک منفرد قسم کا ورکشاپ منعقد ہوا۔ ان ساری نشستوں کی صدارت ڈاکٹر شبیر حسن جوش (اورنگ آباد) نے فرمائی۔ اس میں بطور خاص جن لوگوں کا فکری و عملی تعاون رہا ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

۱:	پروفیسر محمد محمود صدیقی صاحب	پرنسپل بی ایڈ کالج مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی، بھوپال
۲:	ڈاکٹر بدر الاسلام صاحب	پرنسپل اقرا اردو ہائی اسکول، اورنگ آباد
۳:	مولانا محمد طاہر مدنی صاحب	ناظم جامعۃ الفلاح، بلریا گنج
۴:	جناب مجتبیٰ فاروق صاحب	سکریٹری جماعت اسلامی ہند
۵:	جناب محمد اشفاق احمد صاحب	سکریٹری تعلیم مرکز جماعت اسلامی ہند
۶:	جناب سہیل احمد صاحب	
۷:	خان نعیم خاں صاحب	پرنسپل ڈی ایڈ کالج الحرفان اسکول خلد آباد

کلیۃ البنات میں بین المدارس معلمات کا تربیتی پروگرام

۲۸/نومبر ۲۰۱۰ء بروز اتوار انجمن طالبات قدیم کلیۃ البنات بلریا گنج کی جانب سے بین المدارس معلمات کا تربیتی پروگرام منعقد ہوا، جس میں ضلع کے مختلف مدارس اور اسکولوں کی معلمات نے شرکت کی۔

اس تربیتی پروگرام میں درس قرآن اور تذکیر کے علاوہ مختلف موضوعات مثلاً * تربیت اولاد کیوں اور کیسے؟ * ہندوستانی سماج میں خواتین کے مسائل * مغرب کی تہذیبی یلغار اور مسلم معلمات کے اوصاف اور ان کی ذمہ داریاں وغیرہ پر محترمہ سلمیٰ سجاد، سلمیٰ سلامت، سلمیٰ نکہل (ناظمہ) تنظیم، ساجدہ فلاحی، شبینہ انور اور شمیمہ صالحاتی صاحبہ کے علاوہ دیگر معلمات نے بیر حاصل گفتگو کی اور شرکاء کو مستفید کیا۔

☆☆☆

انجمن کے انتخابات

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کے ذمہ داروں کا انتخاب

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کی مجلس نمائندگان کا اجلاس جامعۃ الفلاح بلریا گنج میں ۱۲،۱۱ ردسمبر ۲۰۱۰ء کو منعقد ہوا جس میں میقات ۲۰۱۰ء تا ۲۰۱۳ء کے لئے صدر اور شوریٰ کا انتخاب عمل میں آیا جو حسب ذیل ہے:

صدر:

جناب ڈاکٹر ملک محمد فیصل لکھنؤ

ارکان شوریٰ:

(۱) جناب مشرف حسین صدیقی، دہلی
(۲) جناب رحمت اللہ اثری، جامعۃ الفلاح
(۳) جناب حافظ ادہم علی، ممبئی
(۴) جناب مقبول احمد لکھنؤ
(۵) جناب انعام اللہ، سدھارتھ نگر
(۶) جناب محمد عمران، جامعۃ الفلاح
(۷) جناب ابوالمکارم، دہلی
(۸) جناب اظہر الدین، سدھارتھ نگر
(۹) جناب ڈاکٹر محمد یونس، بھساول
(۱۰) جناب ڈاکٹر ضیاء الدین ملک، علی گڑھ
(۱۱) جناب ڈاکٹر عبدالباری، دہلی
(۱۲) جناب ڈاکٹر محی الدین ساجد، علی گڑھ
(۱۳) جناب محمد افضل، بلریا گنج
(۱۴) جناب ضمیر الحسن، علی گڑھ
(۱۵) جناب شمشاد حسین، دہلی

منجانب: مقبول احمد فلاحی (کنوینر انتخابی کمیٹی)

انجمن کے نومنتخب ذمہ داران برائے میقات جنوری ۲۰۱۱ء تا دسمبر ۲۰۱۳ء

صدر: جناب ڈاکٹر ملک محمد فیصل لکھنؤ

نائب صدور: جناب مشرف حسین صدیقی، دہلی
جناب مقبول احمد فلاحی لکھنؤ

سکریٹری: جناب رضوان احمد رفیقی، دہلی

معاون سکریٹریز: جناب شمس الدین، ممبئی
جناب عرفان احمد، جامعۃ الفلاح

خازن: جناب نعیم احمد غازی، دہلی

مختلف حلقوں کے لئے منتخب کوآرڈینیٹرس

دہلی :	جناب نعیم احمد غازی	مغربی یوپی واترا کھنڈ :	جناب ثاقب حسین
لکھنؤ و مشرقی یوپی :	جناب اظہر الدین	اعظم گڑھ و اطراف :	جناب کمال الدین
راجستھان، گجرات و ہریانہ :	جناب قاسم رسول	مہاراشٹر :	ڈاکٹر محمد یونس
ساؤتھ انڈیا :	جناب اشتیاق عالم	کشمیر :	جناب مجاہد شبیر
سعودی عرب :	جناب انعام اللہ	کویت :	جناب محمد سہیل
نیپال :	جناب نذر الحسن	یو. کے. :	جناب غلام نبی

قطر یونٹ کا انتخاب

انجمن طلبہ قدیم قطر یونٹ کا نیا انتخاب ہوا، جس میں برادر محمد اکرم فلاحی صدر اور برادر فیاض احمد فلاحی سکریٹری اور افضال احسن فلاحی خازن منتخب کئے گئے۔

بھیونڈی یونٹ کا انتخاب

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح بھیونڈی یونٹ کا انتخاب عمل میں آیا۔ جس میں حسب ذیل احباب ذمہ دار منتخب کئے گئے۔

صدر: جناب معین الدین محمد یونس فلاحی

سکریٹری: جناب محمد آصف یعقوب فلاحی

خازن: جناب محمد علیم وکیل فلاحی

دہلی یونٹ کا انتخاب

۲ رجنوری ۲۰۱۱ء مسجد اشاعت اسلام مرکز جماعت اسلامی ہند، دہلی میں نائب صدر، جناب مشرف حسین صدیقی کی نگرانی میں دہلی یونٹ کا انتخاب عمل میں آیا۔ درج ذیل احباب ذمہ دار منتخب ہوئے۔

صدر: جناب عبدالحق فلاحی

سکریٹری: جناب حسن البناء سبحانی

بلریا گنج یونٹ کا انتخاب

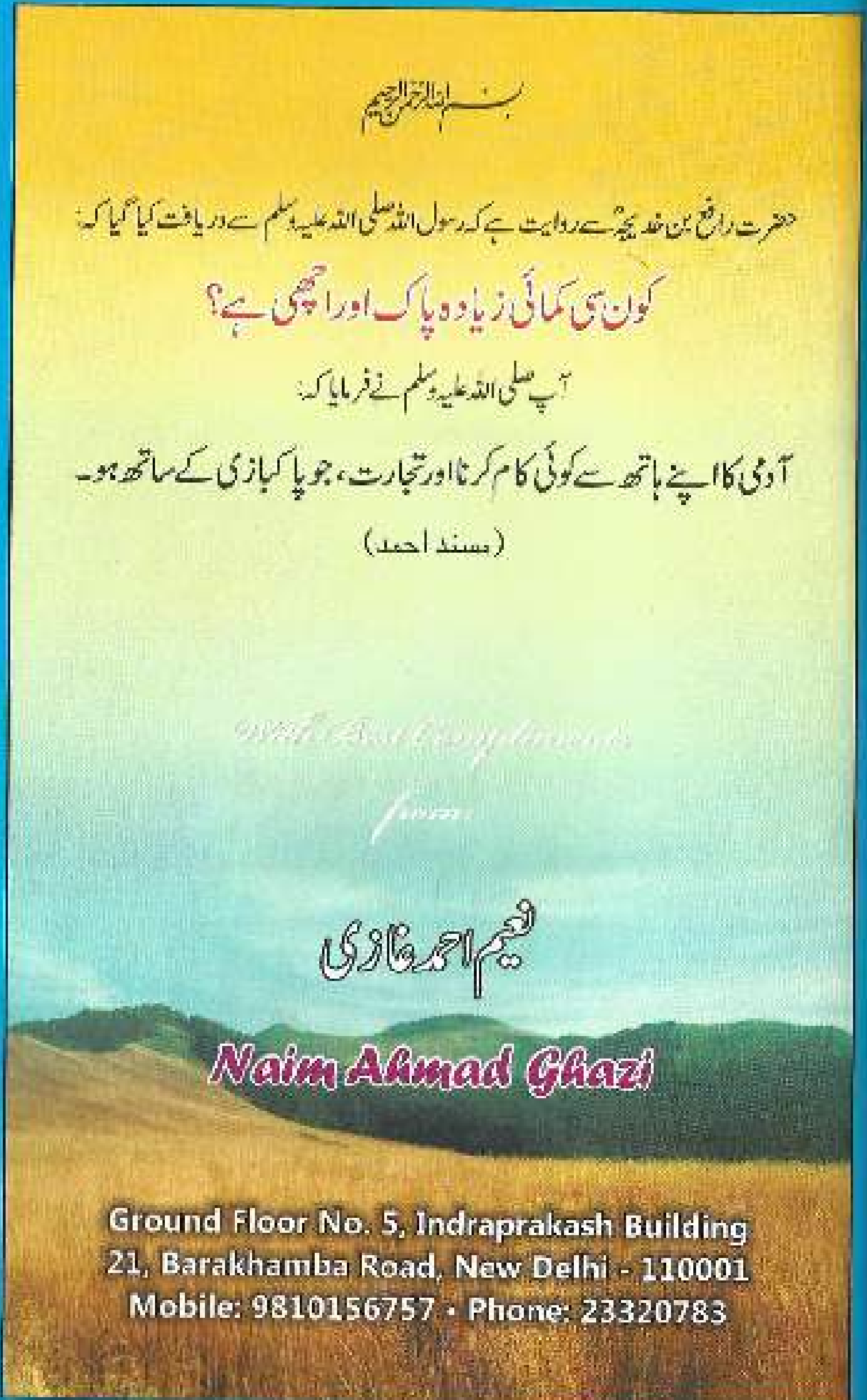

۲؍جنوری ۲۰۱۱ء بعد نماز مغرب مسجد مرکز اسلامی میں صدر انجمن جناب ملک محمد فیصل کی نگرانی میں انتخابی نشست کا انعقاد ہوا۔ تقریباً ۳۰ فلاحیوں نے شرکت کی۔ مندرجہ ذیل افراد کا انتخاب عمل میں آیا:

صدر: جناب محمد افضل

سکریٹری: جناب امتیاز احمد

خازن: جناب ڈاکٹر محمد خالد

اس موقع پر فلاحیوں نے انجمن کا ممبری فارم بھی پر کیا۔

علی گڑھ یونٹ کا انتخاب

۲۳؍جنوری ۲۰۱۱ء کو صدر انجمن کی نگرانی میں درج ذیل احباب کو ذمہ دار منتخب کیا گیا۔

صدر: جناب محی الدین ساجد

سکریٹری: جناب سعید احمد

خازن: جناب غالب نشتر

اللہ تعالیٰ جملہ ذمہ داروں کو حسن عمل کی توفیق عطا فرمائے۔